تاریخ کی چھاؤں میں

ڈاکٹر مبارک علی

بدلتی دنیا پبلی کیشنز
مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد
0333-5577993

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب کا نام : تاریخ کی چھاؤں میں
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام : ایوب ملک
پبلشر : بدلتی دنیا پبلی کیشنز، اسلام آباد
کمپوزنگ : میٹرکس کمپوزر 03005211201
موسمِ اشاعت : جولائی 2017ء
مطبع : محمود برادرز پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

Rs300/-
$ 15/-

ISBN: 978-969-7753-02-4

خوبصورت کتب کی اشاعت کے لیے ہم سے رابطہ کیجیے 0333-5577993

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے اُس میں اُس کی اپنی تحقیق اور خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔ بشری تقاضوں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ (ادارہ)

بدلتی دنیا پبلی کیشنز
مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد
0333-5577993

فہرست

	پیش لفظ	ڈاکٹر مبارک علی	05
	ڈاکٹر مبارک علی: مظلوم طبقات اور محکوم قوموں کا دانشور	ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ	06
	ڈاکٹر مبارک علی: پاکستان کا روایت شکن دانشور	ایوب ملک	08
۱۔	سندھ		15
۲۔	پنجاب		28
۳۔	بلوچستان		42
۴۔	خیبر پختونخواہ		55
۵۔	یونانی فلسفہ		68
۶۔	ہندوستانی فلسفہ		81
۷۔	اسلامی فلسفہ		94
۸۔	تاریخ کے فائدے اور نقصانات		106
۹۔	ہندوستان اور پاکستان میں جمہوریت		122
۱۰۔	سیکولرازم اور تہذیبوں کا تصادم		135
۱۱۔	کیا ہندو، یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے دشمن ہیں؟		144

پیش لفظ

انٹرویو کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپی سیاسی انٹرویو کی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں حالاتِ حاضرہ پر بات چیت بھی ہوتی ہے اور نئے انکشافات بھی کئے جاتے ہیں۔ علمی انٹرویو کا رواج کم ہی ہے۔ جس کی وجہ سے سنجیدہ موضوعات پر بحث و مباحثہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی مسائل کو علمی قالب میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے لایا جائے تا کہ شعور و آگہی پیدا ہو۔

بلند اقبال جو کینیڈا کے راول ٹی وی کے لئے انٹرویو لیتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے موضوعات منتخب کئے جائیں جو وقت کے اہم مسائل پر روشنی ڈال سکیں۔ انٹرویو سے پہلے وہ خود موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مناسب سوالات تیار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انٹرویو دینے والے کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی پوری طرح سے وضاحت کر سکے۔

اس کتاب میں شامل انٹرویوز مختلف موضوعات پر لئے گئے ہیں۔ ان کو تحریر میں لاتے وقت رد و بدل بھی کی گئی ہے تا کہ یہ منظّم شکل میں قارئین کے سامنے آ سکیں۔ آخر میں بلند اقبال اور راول ٹی وی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان اہم موضوعات پر میرے انٹرویوز لے کر اس بات کا موقع دیا کہ میں اپنے خیالات پیش کر سکوں۔

ڈاکٹر مبارک علی

جون ۲۰۱۷ء

لاہور

ڈاکٹر مبارک علی.....مظلوم طبقات اور محکوم قوموں کا دانشور

ڈاکٹر مبارک علی سے شناسائی کا منبع فکری اور نظریاتی یکسانیت تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا وہ مظلوم طبقات اور محکوم قومیتوں کے لئے لکھا جو کئی دہائیوں سے استحصال کی زنجیروں میں مقید ہیں۔ان کی فکری سچائی ہم جیسے سیاسی کارکنوں کے لئے طاقت کا سرچشمہ ہے۔بلوچستان کے ترقی پسند کارکن اور دانشور ڈاکٹر صاحب کی تخلیقی تصانیف سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

میری ڈاکٹر مباک علی سے ذاتی جان کاری نہیں تھی لیکن اپنے آپ کو فکری حوالے سے ان کے بہت قریب پاتا تھا۔میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے اس وقت ہوئی جب میرے دوست کامریڈ ایوب ملک اور محمود باویجہ نے کہا کہ ہم سماجی کاموں کے ساتھ علمی و فکری سیمناروں اور محفلوں کے بھی اہتمام کرتے ہیں تو میں نے فورا کہا کہ پھر کیچ اور گوادر ان سیمناروں کے لئے بہت زرخیز ہیں۔اس لیے آپ جلدی آجائیں کیونکہ ہمارے دوست اس طرح کی محفلوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔چند دنوں بعد ڈاکٹر مبارک ،کامریڈ ایوب ملک محمود باویجہ اور دوسرے دوست تربت پہنچ گئے۔ڈاکٹر مبارک علی کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا تو فورا بولا کہ ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کی کتابیں پڑھ کر اپنی علمی و فکری صلاحیتوں کو وسعت دی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی حیرانگی ہوئی کہ کیچ جیسے پسماندہ علاقوں

میں بھی میرے چاہنے والے بے شمار لوگ موجود ہیں۔

وہاں دوستوں نے سیمینار منعقد کئے جس میں سیاسی کارکنوں ،ادیب اور دانشوروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی ۔جہاں ڈاکٹر صاحب نے مذہبی انتہاپسندی پر اپنا مقالہ پڑھا۔دوسرے دن ایک ظہرانے کا اہتمام کیا گیا اور اس میں علاقے کے تمام سیاسی کارکنوں اور دانشوروں نے شرکت کی اور وہاں کئی گھنٹوں تک ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو رہی۔دوسرے دن گوادر گئے اور وہاں بھی مختلف جگہوں پر محافل کا انعقاد کیا گیا۔

اس کے بعد تو ڈاکٹر صاحب سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور مختلف اوقات میں ایوب ملک کے توسط سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔

میں جب وزیراعلی بنا تو لاہور جانے کا اتفاق ہوا اور ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کے ہاں حاضری دی جائے ۔تب ایوب ملک اور دوسرے دوستوں کے ہمراہ ہم ان سے ملنے ان کے فلیٹ پہنچے وہاں جا کر انہیں کافی ضعیف پایا۔وہ آنکھوں کی بینائی کی وجہ سے کافی پریشان تھے کیونکہ زندگی بھر لکھنے ،پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی اور مشغلہ نہیں تھا۔میں نے بلوچستان حکومت کی طرف سے انہیں علاج کی غرض سے باہر بھیجنے کی تجویز دی تو جواب میں انہوں نے کہا کہ دیکھوں گا علاج سے بہتر ہوگا کہ بھی نہیں۔

آج ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب پر کچھ لکھنا میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے جس کے لئے میں دوستوں اور ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا مشکور ہوں۔

ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ

سابق وزیراعلی بلوچستان

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان کا روایت شکن دانشور

کہتے ہیں کہ دانشور کی زندگی کا مقصد انسانی آزادی اور سماجی شعور میں اضافے کا نام ہے۔ ہمارے عہد کے سب سے ممتاز دانشور نوم چومسکی اپنے آرٹیکل ''دانشوروں کی ذمہ داریوں'' میں دانشور کی تعریف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ طاقتور کے سامنے سچ کا، علم پوری دیانت داری اور حوصلے سے اُٹھانے کی سکت رکھتا ہو۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی ذات میں یہ تمام اوصاف رکھتے ہیں اور یہ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان میں معتوب بھی ہیں۔ نوم چومسکی کہتے ہیں کہ اگر ایسے دانشور معتوب نہ ہوں تو یہ بڑی حیرت کی بات ہو گی۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر مبارک علی کا تعلق دانشوروں کے ایسے معتوب قبیلے سے ہے جنہوں نے تاریخ لکھنے کی ذمہ داری ایک فریضے کی طرح ادا کی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی برصغیر کے ترقی پسند مورخین کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو برصغیر کی ثقافت کو ایک سیکولر نظر سے دیکھتے ہیں۔ آج پاکستان کے سیاسی کارکن خاص طور پر سندھ اور بلوچستان میں ان کی تحریریں پڑھ کر ظلم اور استحصال کے خلاف آواز اُٹھا رہے ہیں اور مستقبل کو بہتر بنانے کی سعی کر رہے ہیں لیکن پاکستان کی اشرافیہ ڈاکٹر مبارک کی ودیعت کردہ روشن خیالی سے خوف زدہ ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کے اس حصے کے سخت ناقد ہیں اور خاص طور پر ان اشعار کے جس میں وہ ''نگاہ مردِ مومن'' اور ''شمشیر و سناں'' جیسے خیالات کی تردید کرتے

ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ چٹانوں پر گھونسلے بنانے اور خودی کو بلند کرتے کرتے یہ ''مردمومن'' خودکش دھماکے کرنے لگا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی سمجھتے ہیں کہ تاریخ صرف بادشاہوں، حکمرانوں اور شاہی خاندانوں کا نام نہیں ہے، بلکہ تاریخ تو عام لوگ بناتے ہیں۔ وہ مزدور جنہوں نے تاج محل بنایا وہ کسان جو ہر ایک کا پیٹ بھرتے ہیں۔ وہ عورتیں جو مردوں کی پشت پناہی کرتی ہیں تاکہ مرد بڑے کارنامے انجام دے سکیں۔ ایسے تاریخ پڑھ کر ایک تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے جس سے ایک آدمی اپنے آپ کو بے بس نہیں پاتا بلکہ اس میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے جس سے وہ اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ وہ قوم پرستی اور مذہبی جنونیت پر لکھی جانے والی تاریخ کو جنگ و جدل کا فروغ قرار دیتے ہیں جس سے جارحیت اور تشدد کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ ایسی تاریخ میں خون خرابہ، مرنا مرانا قتل و غارت کو سراہا جاتا ہے۔ جس سے انسان کے اعلیٰ و نفیس جذبات کم پڑتے ہیں۔ ایسا معاشرہ کسی تعمیری اور تعلیمی عمل پر کاربند رہنے کی بجائے جمود کا شکار ہو جاتا ہے ایسے معاشرے میں غور و فکر، عمل اور تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

مجھے پاکستانی معاشرے میں ڈاکٹر مبارک علی ریاست اور سوسائٹی کے جبر سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، 2005ء کے اوائل میں جب ڈاکٹر صاحب امریکہ سے واپس آئے تو ان کے جہاز کو کراچی میں رُک کر لاہور جانا تھا۔ مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں ایئرپورٹ کے اندر جانے کی سہولت حاصل تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کراچی میں اُتر جانے پر مجبور کیا، جس پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہوئے اور راستہ بھر کوستے رہے۔ میں ایئرپورٹ سے انہیں سندھ ہائی کورٹ لے گیا' جہاں ہمارے سینئر وکلاء، مظہر جمیل، مسلم شمیم اور دیگر شامل ہیں نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کا اہتمام کیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ لاہور ایئرپورٹ پر پنجاب پولیس ان کی گرفتاری کے لئے کھڑی ہے اور ہم انہیں ضمانت دلوائے بغیر لاہور جانے نہیں دیں گے۔ لاہور میں پچھلے کچھ دنوں سے مختلف تھانوں کی پولیس ان کے گھر پر چھاپے مار رہی تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف لاہور کے چار تھانوں میں مختلف ججوں اور وکلاء کی درخواستوں

پر ایف آئی آر میں درج تھیں۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی کچھ کتابوں کو ریاستی اداروں اور ان کے پروردہ دانشوروں نے لاہور شہر کے تمام بک اسٹالوں سے غائب کر کے اس میں کچھ صفحات کا اضافہ کر دیا ہے۔ جن میں عدلیہ کو برا بھلا کہا گیا تھا بعض وکلاء نے ان ججوں کو وہ کتابیں پیش کی ہیں جس کے باعث ان لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کے خلاف پرچے کٹوانے کا بہانہ مل گیا۔ پولیس کے چھاپوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ شدید پریشانی اور تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بہرحال ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا کر انہیں لاہور روانہ کیا اور پھر مختلف عدالتوں میں ڈاکٹر صاحب کی پیشیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں میں ایک عدالتی پیشی کا احوال ضرور لکھنا چاہوں گا۔ جب ایک گواہ نے ڈاکٹر صاحب کی ایک تحریف شدہ کتاب عدالت میں پیش کی، ڈاکٹر صاحب نے اس گواہ سے پوچھا کہ تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟ اُس کے جواب پر ڈاکٹر صاحب نے عدالت کو اصلی کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ کتاب میں نے گواہ کی پیدائش سے پہلے لکھی تھی، اس پر عدالت میں ایک قہقہہ لگا اور گواہ کا جھوٹ بھی سامنے آ گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دن جب میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر موجود تھا تو ایک ایس ایچ او کا فون آیا جو کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو تھانہ میں حاضر ہونے کا کہہ رہا تھا۔ میں یہاں اس ایس ایچ او کے بعض جملے نقل کر رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ ایک دانشور کے خیالات کو ریاستی جبر کے ذریعے کس طرح تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایس ایچ او: .....''او ڈاکٹر، اوے میں تینوں کئی واری بلایا اے، اوے توں تھانے کیوں نہیں آوندا''

ڈاکٹر صاحب.....''جناب میری اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری ہو چکی ہے اور میں نے اپنا مفصل تحریری جواب آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا ہے۔''

ایس ایچ او:.....''او ڈاکٹر، میں سنیا اے تو سٹھ کتاباں لکھیاں نیں، اوے میں اس

توں زیادہ ایف آئی آراں لکھیاں نیں اور جیہڑا گھیو سدھیاں انگلاں نال نہیں نکلدا' میں اونہوں ڈنگیاں اُنگلاں نال وی کڈھ لیناواں۔''

یہ الفاظ اور دھمکیاں ڈاکٹر صاحب جیسے حساس طبیعت دانشور کے لیے کتنے گراں ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔

نجم سیٹھی نے اس دوران ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں ایک مفصل اداریہ لکھا کہ کس طرح تیسری دُنیا میں ریاستی ادارے، دانشوروں کو اپنے نظریات کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو گورنر ہاؤس بلوایا۔ گورنر ہاؤس جانے سے پہلے میں نے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گورنر کے سامنے اپنے نظریات کا پرچار نہ کریں بلکہ صرف ان مقدمات کو ختم کروانے کی کوشش کریں۔ اس موقع پر گورنر نے آئی جی پولیس کو بلوا کر پوچھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک پروفیسر کے خلاف چار ایف آئی آر کٹی ہوئی ہیں جبکہ میرے اپنے گاؤں میں ایک قتل کے خلاف میرے کہنے کے باوجود ایک ایف آئی آر درج نہیں ہوسکی! آئی جی پولیس نے تمام تفصیلات معلوم کر کے گورنر کے سامنے پولیس کو ڈاکٹر صاحب کے خلاف مزید کاروائی سے منع کرنے کا وعدہ کیا۔ آئی جی کے جانے کے بعد گورنر نے ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر بات چیت کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے میرے مشورے کے باوجود اپنے اور ریجنل خیالات کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سُن کر گورنر بہت پریشان ہوا اور اُس نے ڈاکٹر صاحب کو ایک برادرانہ مشورہ دیا جو یہ تھا:

''ان خیالات کے ساتھ آپ پاکستانی معاشرے میں نہیں رہ سکتے، اور یہ کہ آپ پاکستان سے چلے جائیں۔ ورنہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے۔''

مجھے تربت، گوادر اور اندرون سندھ ڈاکٹر صاحب کو لے جانے پر اندازہ ہوا کہ وہاں نوجوانوں میں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوبے جو مرکز اور ریاست کے جبر کا شکار ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو بہت پذیرائی حاصل ہے۔ حالانکہ میں

نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی مخصوص علاقے یا لوگوں کے لیے لکھتے ہوں بلکہ وہ تو عوام میں تاریخی شعور کو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں، مجھے تربت کا ایک واقع یاد آ گیا جب لیکچر کے دوران خفیہ ایجنسی کے بہت سارے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، لیکچر کے بعد جب ہم لوگ ایک کمرے میں چائے پی رہے تھے تو ہمیں ایک مقامی لیڈر نے بتایا کہ ایجنسیوں کے اہلکار ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ اُنہوں نے اس لیکچر میں کیا کہا ہے؟ ڈاکٹر صاحب اس بات پر تھوڑے غصہ میں بھی آئے اور کہا کہ تم لوگ تو لیکچر میں موجود تھے لیکن اُنہوں نے درخواست کی کہ ہمیں ایک دو پیراگراف لکھوا دیجئے تاکہ ہم اپنے اعلیٰ افسران تک پہنچا سکیں کیونکہ یہ ہماری نوکری کا حصہ ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیکچر کا خلاصہ ہوبہو بیان کر دیا۔ دراصل اس سے ایجنسیوں والے ایک پیغام دینا چاہتے تھے کہ آپ کو ہم واچ کر رہے ہیں۔

بہرحال، مجھے تربت اور گوادر کے نوجوانوں کے تجسس اور علمی پیاس نے بہت متاثر کیا اور خاص طور پر نوجوانوں کا وہ تجسس جو اُن میں نیشنل ازم، طبقاتی شعور اور ریاستی جبر کے نتیجہ میں اُبھرا، وہ دیدنی تھا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب جو اپنی سوچ اور فکر کے لحاظ سے روایت شکن لبرل ترقی پسند اور قدامت پرستی کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں اس لیے وہ نا صرف یہ کہ ریاست کے لیے قابل قبول نہیں بلکہ سوسائٹی بھی اپنی تنزل پذیر روایت کی وجہ سے انہیں شرف قبولیت نہیں بخشتی۔ فرد کا ریاست سے لڑنا قدرے آسان ہوتا ہے لیکن جب معاشرہ آپ کا دُشمن ہو جائے تو یہ لڑائی دانشور کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سماج میں حملہ آوروں کے بارے میں نیا شعور پیدا کیا اُنہوں نے بتایا کہ یہ حملہ آور چاہے کسی ملک، قوم، مذہب یا نسل سے ہوں وہ تاریخ میں مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے بغیر کسی وجہ کے مال و دولت کے لالچ یا اپنی سلطنت کو بڑھانے کے لیے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور لوگوں کا قتل عام کیا۔ ڈاکٹر صاحب سکندر اعظم کو اعظم لکھنے پر شدید

اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سماج کا مجرم ہے حملہ آور ہے اس کو اعظم لکھ کر عظمت نہیں دینی چاہیے۔ وہ محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کو بھی اس صف میں شامل کرتے ہیں۔

جاگیرداری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کالونیل دور میں اس ادارے کو حیثیت ملی۔ انگریز حکومت نے ان لوگوں کو مستقل جائیدادیں دے کر ان کے سماجی رُتبے کو استحکام دیا اور یوں اُنہوں نے عام رعایا کو کنٹرول کیا۔ موجودہ دور کے جاگیردار بھی انہی کی اولادیں ہیں اور برسراقتدار جماعت کے ساتھ رہتے ہوئے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تعلیمی نصاب کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نصاب کے ذریعے قومی شعور اور قومی تفاخر کے احساسات کو اُبھار کر عوام کے مائنڈ کو کنٹرول کرنے کا تصور قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد سے شروع ہوا۔ یوں قومی ریاستیں نصابی کتابوں کے ذریعے ان نظریات کا فروغ کرتی ہیں اور ہمارے طالب علموں میں تنگ نظری اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کا اثر پورے معاشرے کے ماحول پر پڑ رہا ہے جس کا شاخسانہ دہشت گردی کا فروغ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں ہیرورشپ سے منع کرتے رہے بلکہ اُنہوں نے ہمیں کہا کہ بزرگوں کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ ڈاکٹر مبارک علی، خالد علیگ اور تسلیم صدیقی کے ساتھ گزارا ہے جس کی بدولت مجھے اپنے اندر کے تضادات کو سمجھنے اور سُلجھانے کا موقع ملا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ ہر مشکل وقت میں ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ کھڑا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے مخلص دوستوں کا تعاون بھی حاصل رہا جن میں خاص طور پر محمود باویجہ، خالد محمود، لیاقت ملک اور مجیب شیخ، پروفیسر توصیف اور سرور جاوید قابل ذکر ہیں۔ یہاں میں خاص طور پر مرحوم حسین بن خامس اور مرحوم مستحسن خان کو یاد کروں گا جن کی بے وقت موت نے ہمارے پرخلوص دوستوں کے گروپ کو منتشر کر دیا۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے دانشور سماج کا بہت بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے جن نظریات کی آدرش میں زندگی گزاری ہے اس کے لیے قربانیاں ہی دینی

پڑتی ہیں اور آج سے سو سال بعد جب ایک نیوٹرل مورخ پاکستانی سماج کی تاریخ لکھے گا تو اس میں ڈاکٹر مبارک علی کی سماجی تبدیلی کی کاوشوں کو سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ خالد بھائی نے کیا خوب کہا ہے:

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

1- صوبہ سندھ

بلند اقبال

آج ہم پاکستان کے صوبہ سندھ کی تاریخ اور کلچر کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس لیے ضروری ہے کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کے تمام صوبوں کو مشرف بہ اسلام کر لیا گیا اور ان کی قدیم تاریخ کو بھلا دیا گیا۔ صوبہ سندھ کے بارے میں جب بھی بات کی جاتی ہے تو محمد بن قاسم کے حملے، ٹھٹھہ میں شاہجہان کی تعمیر کردہ مسجد، محمود غزنوی کی آمد کو تو بیان کر دیا جاتا ہے مگر سندھ کی قدیم تاریخ جس میں موہنجوڈارو اور وادی سندھ شامل ہیں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سندھ کی تاریخ اور کلچر کو پوری طرح سے سمجھ سکیں۔ آج کے اس انٹرویو میں، میں نے پروفیسر مبارک علی صاحب کو دعوت دی ہے کہ وہ ہمیں اس موضوع کے بارے میں بتائیں:۔

ڈاکٹر مبارک علی

یہ بات صحیح ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو بہت محدود انداز میں اور تنگ نظری کے ساتھ پڑھاتے ہیں۔ خاص طور پر قدیم ہندوستان اور اس کی تاریخ کو تقریباً بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب تک ہم تاریخ میں ماضی کے تسلسل کو برقرار نہ رکھیں اس وقت تک ہم ہونے والے واقعات کو پوری طرح نہیں سمجھ پائیں گے۔ سندھ کی سرزمین کو اگر عربوں کی آمد سے پہلے دیکھا جائے تو ہمیں یہاں آریاؤں کی آمد کا ذکر ملتا ہے اور یہ آریا ہی تھے جنہوں نے دریا

کا نام سندھ رکھ کر اس علاقے کو ایک شناخت دی اور یہی شناخت آگے چل کر ہنڈ (Ind) اور ہندوستان میں تبدیل ہوئی۔ ہمیں آریاؤں کے مذہبی تذکروں میں بھی سندھ کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ آریاؤں کے بعد یہاں پر ایرانی آئے جو اپنے ساتھ اپنی زبان اور کلچر کو بھی لے کر آئے اور انہوں نے ہی سندھ کو ہند میں تبدیل کیا۔ یہاں سکندر اور اس کے یونانی ساتھی بھی آئے اور جاتے وقت یونانی تہذیب کے نقوش بھی چھوڑ گئے۔ اس کے بعد یہاں پر بدھ اور جین مت کے پیروکار ہوئے اور آئے بھی۔ سندھ میں قدیم دور کے بہت سے سٹوپا (Stupa) پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر کشن (Kushan) بھی آئے اور ان حملہ آوروں کی وجہ سے سندھ کے سماج میں برابر تبدیل آتی رہی۔

سندھ کی شناخت کی سب سے بڑی علامت وادی سندھ کی تہذیب ہے جس کا دورانیہ قریباً پانچ ہزار سال کا ہے۔ اس طرح یہ میسوپوٹیمیا اور مصر کی تہذیبوں کی ہم عصر ہے لیکن ان کے مقابلے میں اس تہذیب کا کردار بڑا مختلف نظر آتا ہے۔ یہ بلوچستان، سندھ، پنجاب، گجرات اور مدھیہ پردیش تک پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کے اس پھیلاؤ میں ہمیں کہیں جنگوں کے آثار نہیں ملتے ہیں اور نہ ہی قدیم آثار میں کوئی مہلک ہتھیار ہمیں ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد ایک کلچر پر تھی اور یہ کلچر اس کو آپس میں جوڑے ہوئے تھے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس تہذیب میں ہمیں کوئی شاندار محلات، مندر اور مقبرے نظر نہیں آتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست نے اپنے عوام کا استحصال نہیں کیا اور نہ ہی بیگار کے ذریعے ان سے عمارتیں بنوائیں۔ اب آثار قدیمہ میں اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ شاندار عمارتوں اور محلات کے بجائے قدیم آثار میں عام لوگوں کی زندگی تلاش کی جائے لہٰذا وادیِ سندھ کی تہذیب پر اس نقطہ نظر سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حال ہی میں اس کے کئی آثار ہندوستان اور پاکستان میں ملے ہیں اور خاص طور پر مہرگڑھ کی دریافت کے بعد اس تہذیب کی تاریخ تقریباً سات ہزار قبل مسیح تک پہنچ گئی ہے۔ لہٰذا سندھ کے صوبے کے لیے قدیم ماضی کا یہ زرخیز ورثہ ہے جس سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت

ہے۔یعنی شہروں کی منصوبہ بندی، گندے پانی کے نکاس کا نظام، کوڑا کرکٹ اٹھانے کا نظام اور ذاتی صفائی پر زور اس تہذیب کی اہم خصوصیات ہیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ماضی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

سندھ کی تاریخ کا دوسرا اہم دور 711ء میں عربوں کی فتح سندھ سے شروع ہوتا ہے۔عربوں نے سندھ پر کیوں حملہ ہے؟ اس کا اخلاقی جواز کیا تھا اور اس کے کیا نتائج نکلے؟ یہ سب کچھ ہم سندھ کی تاریخ کے اولین مآخذ ''چچ نامہ'' میں پاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی جس کا مصنف مدائنی تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ناصرالدین قباچہ کے عہد حکومت میں علی کوفی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب درحقیقت فاتحین کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے سندھ سیاسی اور سماجی طور پر بدحالی کا شکار تھا۔

راجہ داہر کی اخلاقی برائی کو اس سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اس نے اپنی بہن سے شادی کر لی تھی اور یہ تاثر دیا گیا ہے کہ عربوں کی فتح نے سندھ کو ایک جابر کی حکومت سے آزاد کرایا۔اس کے مقابلے میں چونکہ ہمارے پاس شکست خوردہ سندھیوں کا کوئی مآخذ نہیں ہے اور نہ ہی راجہ داہر کے دفاع میں کوئی بات کی جاتی ہے۔اس لیے ہم عربوں کی فتح کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔تاریخ کی ماہرین نے ''چچ نامہ'' میں کئی غلطیاں نکالی ہیں۔مترجم نے ترجمہ کرتے وقت اپنے عہد کی بہت سی اصطلاحات کو اس میں شامل کر لیا ہے۔اس کی یہ روایت کہ محمد بن قاسم کو گائے کی کھال میں سلوا کر واپس بھیجا گیا۔ یہ بھی تاریخی طور پر غلط ہے کیونکہ یہ سزا عربوں میں نہیں دی جاتی تھی بلکہ مترجم کے عہد میں منگولوں کے ہاں رائج تھی۔لہٰذا جب ہم تاریخ کے کسی بھی مآخذ کو ایک ہی نقطہ نظر سے پڑھیں گے تو اس صورت میں ہمارا تاریخی نقطہ نظر بھی تنگ نظری ہی پر مبنی ہوگا۔موجودہ دور میں تاریخ کے کئی اور ماخذ بھی سامنے آ رہے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ عربوں کی فتحِ سندھ کا نئے سرے سے تجزیہ کیا جائے۔

بلند اقبال

یہاں میں معافی چاہوں گا اور یہ سوال کروں گا کہ محمد بن قاسم کی آمد کے وقت یہاں راجہ داہر کی حکومت تھی جو ہندو مذہب کا پیروکار تھا جب کہ اس کی رعایا میں اکثریت بدھ مذہب کو ماننے والی تھی تو کیا یہ صحیح ہے کہ رعایا کہ اکثریت داہر کی حکومت کے خلاف تھی اور سمجھتی تھی کہ ان کا استحصال کیا جارہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

جہاں تک یہ سوال ہے کہ کیا چچ اور داہر کی حکومتیں ظالمانہ تھیں تو ہمارے پاس اس کے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو بادشاہت کے نظام میں ظلم و جبر چھپا ہوتا ہے۔اس میں رعایا کے لیے یہ لازمی ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کے وفادار رہیں اس کی اطاعت کریں اور اس کے خلاف بغاوت ایک بھانک جرم سمجھا جاتا ہے۔ یہ صورتحال کوئی عربوں کے قیام سلطنت کے بعد بھی تبدیل نہیں ہوئی۔عربوں کی ریاست نے بھی انہی روایات کی پابندی کی جو اس سے پہلے بادشاہت کی تھیں۔

اب جہاں تک سندھ کی فتح کا سوال ہے تو محمد بن قاسم کا یہ حملہ اولین نہیں تھا۔اس سے پہلے بھی سندھ کی فتح کے لیے حضرت عمرؓ کے زمانے سے لے کر بنوامیہ تک کئی مہمات بھیجی گئی تھیں مگر اس وقت تک حالات فتح کے لیے سازگار نہیں تھے۔ 711ء میں یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ عرب تاجر جو سری لنکا اور چین کے لئے تجارت کرتے تھے، بحر ہند اور دیبل کی بندرگاہ ان کے لئے محفوظ نہ تھی۔ یہاں بحری قزاق تھے جو ان کے سامان کو لوٹ لیتے تھے۔ اس لیے ان تاجروں کی جانب سے یہ مطالبہ تھا کہ سندھ کو فتح کیا جائے تا کہ ان کی تجارت کے لیے بحری راستے محفوظ ہو جائیں۔اور فتح کے بعد اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

بلند اقبال

یہاں میرا ایک سوال ہے؟ کہا جاتا ہے کہ جب سکندر سندھ میں آیا تو اس کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے یہ کہا کہ ہر وہ بیٹا جس کو سندھ کی ماں نے جنم دیا ہے، بہادر اور نڈر ہے اور کیا چندر گپت موریہ اور اشوک کے زمانے میں سندھ کا کوئی ذکر ملتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

قدیم تاریخ کا مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ ہمارے پاس اس کے مآخذ نہیں ہوتے ہیں اس لیے آنے والی نسلیں، تاریخ کو اپنی خواہشات کے مطابق تشکیل دے دیتی ہیں۔ جہاں تک سکندر کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں ہماری تمام معلومات یونانی مورخوں کے ذریعے ہیں جو ایک فاتح کی تاریخ ہے۔ لیکن اب موجودہ زمانے میں سندھ اور پنجاب میں سکندر کے حملوں کے بارے میں مختلف روایات کی بنیاد پر تاریخ کو تشکیل کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف قبائل نے سکندر سے جنگوں میں اپنی بہادری کو ثابت کیا ہے۔ کہیں راجہ پورس کی شکست کو فتح بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں یونانیوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی برتری کا اظہار کیا گیا ہے۔ جہاں تک چندر گپت اور موریہ بادشاہوں کا ذکر ہے تو ان کا تعلق سندھ سے کبھی نہیں رہا۔

بلند اقبال

اب میں سندھ کے اسلامی دور حکومت پر آؤں گا کہ یہاں انگریزوں کی آمد سے پہلے کن کن خاندانوں کی حکومت رہی اور سندھ کن کن ادوار سے گزرا؟

پروفیسر ڈاکٹر مبارک صاحب

برصغیر ہندوستان میں 1924ء میں اس وقت تبدیلی آئی جب یہاں فرقہ پرستی کے

جذبات عروج پر پہنچے۔ اس وقت مسلمان مؤرخین نے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کو بطور فاتح پیش کیا جنہوں نے ہندوؤں کو شکستیں دیں۔ یہ ایک سیاسی ردِعمل تھا ورنہ اس سے پہلے مغل عہد تک محمد بن قاسم، غزنوی اور غوری کو تاریخوں میں بطور ہیرو پیش نہیں کیا گیا۔ تاریخ نویسی میں اس وقت بھی تبدیلی آئی جب سندھ میں قوم پرستی کی تحریک ابھری۔ جی ایم سید نے اپنے ایک کتابچے (سندھ جو سورما) میں محمد بن قاسم کو امیہ سامراج کا ایک نمائندہ قرار دیا ہے۔ جس نے توسیع سلطنت کے لئے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ تاریخ کی اس تشریح سے عربوں کی فتح اسلامی نہیں بلکہ سیاسی اور سیکولر تھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سندھ میں اسلام کیونکر پھیلا سندھ کا معاشرہ چونکہ قبائلی تھا، اس لیے عربوں کے اقتدار میں آنے کے بعد جب مختلف قبائل کو تحفظ کی ضرورت ہوئی اور ان کے سردار نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے قبیلے والوں نے بھی اپنے سردار کی پیروی کی لہٰذا یہاں اسلام کسی تبلیغ کے ذریعے سے نہیں مقبول اور نہ ہی ریاست کی جانب سے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ جب مصر میں فاطمی سلطنت قائم ہوئی تو ان کے زمانے میں اسماعیلی مشنری سندھ میں آئے اور انہوں نے یہاں اپنے فرقے کی تبلیغ کر کے کچھ طبقوں کو اسماعیلی بنایا مثلاً سندھ کا آخری عرب خاندان جس نے اپنا اقتدار قائم کیا وہ ہیاری تھے جن کا دارالسلطنت منصورہ تھا، محمود غزنوی نے نہ صرف ہیاری سلطنت کا خاتمہ کیا بلکہ ملتان میں قائم شدہ اسماعیلی حکومت کو شکست دے کر ان کے اقتدار کو ختم کیا۔

اس کے بعد سندھ میں ہم مقامی خاندانوں کی حکومت دیکھتے ہیں جن میں سومرا اور سمہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد ارغون اور برقان افغانستان سے آئے۔ ان کی حکومت کا خاتمہ اکبر کے دور میں ہوا جب سندھ کو فتح کر کے اس سے مغل سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ جب مغلوں کا زوال ہوا تو سندھ میں کلہوڑا خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ ان کے عہد حکومت میں سندھ کو متحد رکھنے کی کوششیں ہوئیں۔ حیدرآباد کا نیا شہر آباد کیا گیا اور جب ان کا زوال ہوا تو تالپور خاندان کے پاس حکومت آئی۔ تالپوروں نے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی حیدرآباد،

میر پور خاص اور خیر پور۔ ان کے عہد حکومت میں سندھ نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ جبکہ یہ وہی زمانہ تھا جب برصغیر پر ہندوستان میں انگریز اپنے اقتدار کو پھیلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سیاسی مشن سندھ بھیجے اور سندھ کے سیاسی اور سماجی حالات سے آگاہی حاصل کی۔ اسی لیے جب 1843ء میں چارلیس نیپئر نے سندھ پر حملہ کیا اور اسے میانی اور دیبہ کی جنگوں سے کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فتح کے بعد سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی کا ایک حصہ بنا دیا گیا اور کراچی کو انتظامی مرکز کی حیثیت دے کر اس کو جدید شہر بنایا گیا۔

انگریزوں کی فتح کے سندھ پر گہرے اثرات ہوئے۔ مثلاً انہوں نے سندھی زبان جو اب تک کئی رسم الخطوط میں لکھی جاتی تھی ایک رسم الخط مقرر کیا جس کی وجہ سے زبان کی اہمیت ہوئی اور سرکاری دستاویزات اور ریکارڈ خاص طور پر ریونیو اور پولیس تھانوں کے رجسٹر سندھی زبان میں ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سندھ لٹریچر میں اضافہ ہوا اور شاہ جو رسالو کا ایک مستند ایڈیشن شائع کیا گیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری معاشرے میں اور زیادہ مقبول ہوئی۔ رسم الخط کی وجہ سے رسالے اور کتابوں کی اشاعت بڑھی۔ دوسرا اہم کام یہ ہوا کہ سندھ کی تاریخ کی تشکیل کے لیے سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں مورخ اپنے تحقیقی مقالات پیش کرتے تھے اور پھر یہ سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین کی اشاعت کی وجہ سے سندھ کی تاریخ کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔

برطانوی حکومت کا ایک اہم اثر یہ ہوا کہ سندھ کے ہندو تاجر جن کی تجارت اب تک سندھ میں محدود تھے، برطانوی حکومت کے شہری بننے کے بعد ان کے لئے ایشیاء اور افریقہ میں برطانوی کالونیوں میں تجارت کی آسانیاں ہوگئیں لہٰذا دور شہر کے تاجروں نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ حیدر آباد کے تاجروں نے اپنی تجارت کو ہندوستان میں پھیلایا۔ اس کے بعد یہ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ کے شہروں میں گئے، وہاں سے یہ افریقہ آئے جن میں یوگنڈا، کینیا اور نائیجیریا قابل ذکر ہیں، جراٹر میں بھی انہوں نے اپنی تجارت کو قائم کیا اور یہاں سے سندھی تاجر لاطینی امریکہ تک بھی گئے۔ دوسری جانب شکار پور کے تاجر افغانستان سے ہوتے ہوئے وسط ایشیاء اور روس تک گئے اور جب 1917ء میں روسی انقلاب آیا تو یہ سنکیانگ جا کر آباد

ہوگئے۔ ان تاجروں کی وجہ سے شکار پور اور حیدر آباد دونوں شہر ثقافتی اور سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ یہاں ان تاجروں کے بنائے ہوئے شاندار رہائشی مکانات اوران میں استعمال ہونے والی ٹائلز ان کے ذوق جمال کو ظاہر کرتی ہیں۔ حیدر آباد میں ہیرآباد اور عامل کالونی کے مکانات بھی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہیں۔اس کے علاوہ ان لوگوں نے شہروں میں تعلیمی ادارے کھولے، باغات کی بنیاد رکھی، کتب خانے قائم کئے، نئے کلب قائم کیے جہاں تھیٹر اور موسیقی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ پبلک ہال بنے جہاں اہم شخصیات کے لیکچروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی بنانے کا بھی منصوبہ تھا جو پورا نہیں ہوا لیکن اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سندھ کا ہر شہر جیسے لاڑکانہ، سکھر، حیدرآباد اور شکارپور وغیرہ اپنی اپنی جگہ ثقافتی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ان شہروں سے اخبارات شائع ہوتے تھے۔ کتابیں شائع ہوتی تھیں اور علم و داب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔اس وقت تک کراچی ایک چھوٹا صاف ستھرا انتظامی اور تجارتی شہر تھا۔ لہٰذا ان شہروں کی آزاد حیثیت کی وجہ سے سندھ کے کلچر میں اضافہ ہورہا تھا۔ خاص طور سے ہندو متوسط طبقہ جو تعلیم یافتہ بھی تھا، باصلاحیت بھی تھا اور انگریزی کلچر سے متاثر بھی تھا، اس نے سندھ کے شہروں میں رہتے ہوئے اس کو ایک ترقی یافتہ علاقہ بنایا۔ بمبئی پریذیڈنسی سے الحاق کی وجہ سے بھی سندھ کا تعلیمی معیار بڑھا اور سندھ کے معاشرے میں جدید روایات آئیں۔

اس پورے تاریخی عہد میں سندھ کی ہمیشہ سے ایک آزادانہ شناخت رہی ہے۔ مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے اس نے خود کو علیحدگی میں رکھتے ہوئے اپنی زبان اور کلچر کو فروغ دیا، تقسیم ہند میں بھی جہاں اور صوبے تقسیم ہوئے ، وہاں سندھ اس عمل سے نہیں گزرا اور اپنی تاریخی، جغرافیائی حیثیت کو برقرار رکھا۔

بلند اقبال

قیام پاکستان کے بعد سندھ میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں؟ مہاجرین کی آمد کی وجہ سے سندھ کے شہر کس طرح سے تبدیل ہوئے اور ان سب کے سندھ کے معاشرے پر کیا اثرات ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر کی تقسیم کا سب سے زیادہ اثر سندھ پر ہوا۔ اگر چہ پنجاب اور مشرقی بنگال کی تقسیم نے بھی تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور سندھ اس طرح کی خونریزی سے دو چار نہیں ہوا لیکن سندھ کے معاشرے میں اس وقت تبدیلی آئی جب تقسیم کے فوراً ہی بعد سندھی ہندو متوسط طبقے نے یہ محسوس کیا کہ آنے والے وقتوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ان کی جان و مال کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ تو انہوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ سندھ سے ہجرت کر جائیں۔ ان کے جانے کے بعد سندھ کے وہ تمام شہر جو اب تک تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھے، ان کی یہ حیثیت ختم ہوگئی۔ جو ہندو سندھ میں مقیم رہے ان کا تعلق ایک تو نچلے طبقے سے تھا اور دوسرے یہ زیادہ تر تھرپارکر کے شہروں اور دیہات میں مقیم تھے۔ اس لیے ان کی سیاسی حیثیت بہت کمزور تھی۔ شہروں میں آباد سندھی ہندوؤں کے جانے کے بعد مہاجروں کی ایک بڑی تعداد ان شہروں میں آ کر آباد ہوئی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنا کلچر لے کر آئے تھے۔ چونکہ سندھی ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ جا چکا تھا، اس لیے ان مہاجروں نے ملازمتوں، تجارت اور دوسرے اہم پیشوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ سیاسی طور پر بھی یہ بااثر اور بارسوخ ہوگئے۔ تبدیلی اس وقت آنا شروع ہوئی جب وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ایک نیا سندھی متوسط طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے جب سندھ کے بڑے شہروں میں آئے تو یہاں انہوں نے خود کو ایک اجنبی کلچر میں پایا اور اپنی ہی سرزمین پر خود کو بے دست و پا اور مجبور محسوس کیا۔ اسی وجہ سے ان میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلچر کو محفوظ کر کے اپنی سندھی شناخت کو قائم رکھیں۔ لہٰذا یہ وہ صورتحال تھی کہ جب مہاجر اور سندھی تصادم پیدا ہونا شروع ہوا۔ مہاجر متوسط طبقہ جو اب تک تمام مراعات حاصل کیے ہوئے تھا اور اسے کوئی چیلنج درپیش نہیں تھا، وہ اپنی برتر حیثیت اور اپنی سہولتوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لہٰذا تنازعہ اس پر شروع ہوا کہ پیشہ ور کالجوں میں یعنی میڈیکل، انجینئرنگ اور یونیورسٹیز میں داخلوں کے سلسلے میں سندھی متوسط طبقے کو سہولتیں دی

جائیں۔ روزگار کے حصول نے بھی اس تصادم کو مزید ہوا دی۔ سیاست دانوں نے بھی دونوں جانب سے مہاجر اور سندھی احساسات کو مشتعل کر کے اپنی لیڈرشپ کو قائم کرنے کی کوشش کی۔

بلند اقبال

مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو مہاجرین ہندوستان سے آئے، ان میں احساس برتری تھا۔ وہ سندھیوں کو اپنے مقابلے میں کم تر سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ دہلی اور دکن کی ترقی یافتہ تہذیبیں لے کر آئے ہیں۔ جب میں طالب علم تھا تو اس وقت بھی میں نے اس چیز کو محسوس کیا تھا کہ مہاجرین میں برتری کا احساس ہے جس نے ان میں اور سندھیوں میں دوری اور فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی

یہ صحیح ہے۔ برتری کے احساس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سندھی ہندو تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کے جانے کے بعد ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسرا شمالی ہندوستان سے جو لوگ آئے تھے یہ اپنے ساتھ مذہبی اصلاحی تحریکوں کو بھی لائے تھے جیسے دیوبندی، سُنی بریلوی، اہل حدیث اور وہابی وغیرہ ان کا یہ خیال تھا کہ سندھ کے مسلمان چونکہ ہندو کلچر کے زیر اثر رہے ہیں لہٰذا ان کو صحیح اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت کے تمام تعلیمی اداروں میں اُردو بولنے والوں اساتذہ کی تعداد زیادہ تھی۔ تیسرے سرکاری ملازمتوں پر بھی ان کا قبضہ تھا۔ چوتھے، شہروں میں سندھی ہندوؤں کے مکانات اور جائیدادوں سے بھی انہوں نے فوائد اٹھائے۔ اس کے مقابلے میں مہاجرین کے پاس اُردو زبان، شمالی ہندوستان کی تاریخ یا عربوں کی فتح سندھ کی تاریخ تھی لیکن ان کے پاس وہ قوت اور طاقت نہیں تھی کہ وہ قوم پرستی کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لیے آہستہ آہستہ اردو بولنے والوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ سندھیوں کے مقابلے میں اس لیے نہیں ٹھہر سکے کیونکہ انہوں نے سندھی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی سندھ کی تاریخ کو سمجھنے کی۔ لہٰذا یہ دونوں کمیونیٹیز ایک دوسرے کے سامنے مخالفانہ طور پر تصادم

کے لیے تیار ہوگئیں۔

بلند اقبال

آخر کیا وجہ تھی کہ ہندوستان سے آنے والوں نے خود کو سندھی معاشرے میں ضم ہونے کی بجائے علیحدہ رکھا اور خود کو نئے سندھی بنانے کی کوشش نہیں کی؟

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان سے آنے والوں نے خود کو اس لیے سندھی معاشرے میں ضم نہیں کیا کیونکہ اول تو ان میں تہذیبی برتری کا احساس تھا اور دوسرے چونکہ وہ شہروں میں آ کر آباد ہوئے جہاں ان کو اکثریت تھی اور سندھیوں سے ان کے تعلقات کم سے کم تھے، اس لیے انہوں نے سندھی زبان اور کلچر کو اختیار کرنا ضروری نہیں سمجھا لیکن جو مہاجرین اندرونِ سندھ آباد ہوئے انہوں نے نہ صرف سندھی کلچر کو مکمل طور پر اختیار کیا بلکہ سندھی زبان کو بھی اپنا لیا۔ اس لیے میرے خیال میں اس مسئلے پر اس وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا بھی دخل ہے۔

بلند اقبال

وفاق کی جانب سے سندھ کے حقوق کو جس طرح سے غصب کیا گیا، اس کے اثرات سندھ کے معاشرے پر کیا ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سندھ کو ابتدا ہی سے یہ شکایت رہی ہے کہ اس کو مکمل حقوق نہیں دیئے گئے، پاکستان بننے کے فوراً بعد جب کراچی کو دارالحکومت بنایا گیا تو اس پر بھی سندھیوں کی جانب سے سخت احتجاج کیا گیا۔ دوسرے، جب مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنایا گیا تو اس موقع پر بھی سندھ میں ایک تحریک چلی۔ بدقسمتی سے اُردو بولنے والوں نے سندھیوں کا اس تحریک میں ساتھ نہیں دیا۔

سندھ کی اپنی شناخت کے ختم ہونے کا یہ احساس تھا کہ جس نے سندھ میں مختلف تحریکوں کو جنم دیا۔ مثلاً جی ایم سید نے ''بزم صوفیا'' کے نام سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ سندھ گریجویٹ ایسوسی ایشن بنائی گئی تا کہ سندھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک جماعت میں آرگنائز کیا جائے۔ ''سندھی ادبی سنگت'' کا قیام عمل میں آیا تا کہ سندھی ادب کو فروغ دیا جائے کہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے، اس کے زیر اثر سندھ میں دانش وروں نے ادب کے ذریعے نوجوانوں کو ذہنی طور پر باشعور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

بلند اقبال

یہاں پر یہ سوال کروں گا کہ یہ دو ملین مہاجر جو سندھ میں آئے انہوں نے سندھ کی تہذیب، کلچر اور سیاست میں کیا کردار ادا کیا؟ اور کیا وجہ تھی کہ انہوں نے پرامن اور مثبت ذرائع کو استعمال کرنے کی بجائے عسکری راستہ اختیار کیا اور سندھ کو تصادم کی راہ پر لگا دیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا۔ اُردو بولنے والوں نے ون یونٹ کے قیام کے وقت سندھیوں کی بجائے وفاق کا ساتھ دیا اور شاید یہیں سے دونوں کی راہیں جدا ہوگئیں۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ کی سیاست مہاجروں اور سندھیوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ سندھیوں کے خلاف یہاں مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ بنایا گیا جس نے اختلافات اور فرق کو اور زیادہ بڑھاوا دیا۔ جب ایم کیو ایم کا قیام عمل میں آیا تو اس نے سندھ میں مہاجروں اور سندھیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایم کیو ایم کو ایک Ethnic جماعت کی بجائے طبقاتی بنیاد پر محروم لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہیے تھا ان محروم لوگوں میں سندھ کے ہاری بھی تھے، سندھ کے پسماندہ قبائل، کوہلی بھیل اور میگوار بھی تھے، پٹھان اور پنجابی مزدور بھی تھے۔ اگر ان محروم طبقوں کو متحد کر کے سندھ کی سیاست کی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک تبدیلی کا باعث ہوتی لیکن جب اس کی بجائے نسلی بنیادوں پر سیاست ہوئی تو سندھ کا وڈیرہ اور ہاری ایک ہوگئے۔ دوسری

جانب غیر سندھی صنعتکار اور تاجر اور مزدور برابر ہو گئے اور لوگوں میں طبقاتی شعور کے بجائے تنگ نظری کے احساسات پیدا ہوئے۔ اس نے سندھ کی سیاست کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

دوسرا اثر اس تقسیم کا یہ ہوا کہ ایم کیو ایم اور جیئے سندھ دونوں نے سندھ کے تعلیمی اداروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ امتحانوں میں نقل کرانا، اساتذہ کو مارنا پیٹنا اور اس طرح سے دھونس جما کر ڈگریاں حاصل کرنا ایک روایت بن گئی۔ اس نے مہاجر اور سندھی دونوں کو تعلیم، شعور اور اخلاقی قدروں سے محروم کر دیا۔ اس لیے اس وقت سندھ جس صورتحال سے دوچار ہے اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اور سندھی بولنے والے دانشور بدلتے ہوئے حالات کا تجزیہ کریں اور ایک تحریک کے ذریعے سندھ کے معاشرے کی تشکیلِ نو کریں۔

آپ نے ایک اہم سوال یہ کیا تھا کہ تاریخ میں شخصیتوں کا کیا کردار رہا ہے؟ شخصیتوں کی اہمیت اس وقت تک رہی جب معاشرے میں بادشاہت کا نظام تھا اور امرا کا طبقہ اپنے اقتدار کو قائم رکھے ہوئے تھے لیکن وقت کے ساتھ جمہوری روایات میں شخصیتوں کا اثر ختم ہوتا چلا گیا۔ اب معاشرے خود کو اپنی اندرونی قوت اور طاقت سے تبدیل کرتے ہیں اور شخصیتوں پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ لہٰذا سندھ کی سیاست میں بھی جو شخصیات کا اثر ہے جن میں وڈیرے، پیر اور مذہبی راہنما شامل ہیں ان سے چھٹکارا پانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سے اُردو بولنے والوں کو اپنی شناخت کی تلاش ماضی کے بجائے سندھ میں کرنی چاہیے، شاید یہی وہ جذبہ ہو جو آگے چل کر باہمی تعلق کی راہ ہموار کر دے۔

☆.....☆.....☆

2- پنجاب

بلند اقبال

آج ہم پنج آب یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین کا ذکر کریں گے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی میرے ساتھ ہیں۔ پروگرام کے ناظرین بھی اس پر خوش ہوتے ہیں، میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مبارک علی

صوبے پنجاب کی تاریخ اور کلچر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام ادوار کا مطالعہ کیا جائے اور یہ تجزیہ کیا جائے کہ ان سے گزر کر اس صوبے کی تاریخی شناخت کی لکیر اُبھری، مثلاً سب سے پہلے ہم یہاں وادی سندھ کی تہذیب کے آثار دیکھتے ہیں، 1920ء میں اس تہذیب کی کھدائی کے دوران ہڑپہ کا شہر دریافت ہوا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی اور پلاننگ کے نقطہ نظر سے یہ ایک ترقی یافتہ شہر تھا اس کے بعد محکمہ آثار قدیمہ نے چولستان کے صحرا میں وادی سندھ کے کئی شہر دریافت کئے جو لاکھڑا دریا کے کنارے آباد تھے، دریا کے خشک ہونے کی وجہ سے یہ بستیاں بھی اُجڑ گئیں۔ تاریخ کا دوسرا اہم موڑ آریاؤں کی آمد کا ہے جو ایک ہزار پانچ سو سال قبل مسیح میں یہاں آنا شروع ہوئے ان کی ابتدائی تہذیب کی تشکیل اسی علاقے میں ہوئی ان کی سب سے پہلی وید یعنی رگ وید یہیں پر لکھی گئی جس میں ان کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کی معلومات درج ہیں، آریاؤں کے بعد یہاں ایرانی حملہ آور آئے اور اپنے ساتھ

زرتشت مذہب کے عقائد بھی لے کر آئے۔ ایرانیوں کے بعد یہاں یونانیوں کے حملے ہوئے اور سکندر کو کئی خونریز جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کی واپسی کے بعد یہاں کئی یونانی آبادیاں قائم ہوگئیں کہا جاتا ہے کہ کیلاش کے باشندے یونانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے حال ہی میں یونانی حکومت نے ان کے تحفظ کے لیے کئی اقدامات کئے ہیں۔ سکندر کے جانے کے بعد ہندوستان پر موریا خاندان کی حکومت اقتدار میں آئی۔ اس کا پہلا حکمران چندر گپت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سلکس جو اسکندر کا جانشین تھا اُسے صلاح کے بعد اس کی بیٹی سے شادی کی تھی، موریا دور میں پنجاب ان کی سلطنت کا ایک حصہ رہا تھا، جس میں گندھارا تہذیب کا ارتقاء ہوا۔

پنجاب کی تاریخ کا اہم دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہاں خیبر کے راستے ترک حملہ آور ہوئے، ان حملہ آوروں میں سب سے اوّلین حیثیت محمود غزنوی کی ہے اس نے پنجاب پر قبضہ کر کے اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو تو پنجاب میں ٹھہر کر آگے کی جانب جائے۔ غزنوی عہد ہی میں لاہور کا شہر ثقافتی طور پر نمایاں ہوا۔ کیونکہ جب پنجاب اور افغانستان کے راستے پُر امن ہوگئے تو وسطی ایشیاء اور ایران سے علماء، شعراء، ادبا اور تاجر پنجاب آنا شروع ہوگئے، محمود کے گورنر ایاز نے شہر میں قلعہ تعمیر کرایا۔ یہاں کی منڈیوں میں آنے والے مال کی وجہ سے چہل پہل ہوگئی۔ مذہبی عقیدت کے طور پر مساجد کی تعمیر ہوئی اور یوں یہ شہر افغانستان اور ایران سے مل کر ایک نئی شکل کے ساتھ ابھرا جب غزنوی خاندان کا زوال ہوا تو اس کے آخری سلطان خسرو ملک نے یہیں پناہ لی اور محمود غوری کے ہاتھوں قتل ہوا۔

سلاطین کے دور میں بھی پنجاب کی اہمیت رہی دہلی کے ساتھ ساتھ لاہور بھی سیاست کا مرکز تھا، قطب الدین ایبک بھی یہیں پر پولو کھیلتے ہوئے جان سے گیا تھا۔ جب مغل اقتدار میں آئے ہیں تو اُن کے عہد میں بھی پنجاب ایک اہم صوبہ رہا ہے۔ جب اکبر نے تقریباً 13 سال لاہور میں قیام کیا تو شہر میں نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور علماء اور فضلاء نے یہاں قیام

اختیار کیا۔ لہٰذا پورے مغل عہد میں لاہور ان کا دارالحکومت رہا۔ لیکن جب مغلوں کا زوال ہوا تو اس دوران افغانستان سے حملہ آور آنا شروع ہوئے جن کا مقصد ہندوستان کی دولت کو لوٹنا تھا۔ سب سے پہلے نادر شاہ آیا جب یہ لوٹ مار کا مال چھکڑوں اور اونٹوں پر لاد کر واپس چلا گیا۔ تو پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے اس کی لوٹ مار سے پنجاب کے لوگ اس قدر تنگ تھے کہ یہ کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ جو کھانا پینا ہے کھالو باقی احمد شاہ ابدالی کا ہے۔ اس سیاسی ابتری بدامنی اور عدم تحفظ کے وقت سکھوں کے قبائل ایک قوت بن کر اُبھرے اور سکھوں کے سرداروں میں سے ایک رنجیت سنگھ نے اپنی فوجی طاقت اور ڈپلومیسی کے ذریعے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس نے پنجاب کی حفاظت کے لئے دو اہم اقدامات کئے۔ اول اس نے افغان حملہ آوروں کو روکا دوسرے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی انگریزوں کی طاقت سے معاہدے کر کے پنجاب کو اُن سے محفوظ رکھا، رنجیت سنگھ کی حکومت کی ایک خاص بات تو یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی سکھوں کی حکومت تھی جو پنجاب میں قائم ہوئی، دوسرے یہ پنجابیوں کی حکومت تھی جو اپنے صوبے میں اقتدار میں آئی ورنہ اس سے پہلے پنجاب پر غیر پنجابی ہی حکومت کرتے رہے تھے۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کے جانشین نااہل ثابت ہوئے اور آپس کے ان جھگڑوں اور فسادات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ موقعہ دیا کہ وہ پنجاب پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو جائے اگرچہ سکھوں نے بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن اپنی حکومت کو بچانے میں ناکام رہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ذرا یہ بتائیں کہ سکھوں کی حکومت کے بعد پنجاب کن حالات سے گزرا؟

ڈاکٹر مبارک علی

انگریزوں نے 1849ء میں پنجاب کو فتح کیا یہ ہندوستان کا وہ آخری علاقہ تھا جس

پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوا اور یوں ان کا اقتدار پورے ہندوستان پر پھیل گیا۔ کیونکہ اس دوران انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کرتے ہوئے کافی تجربات کر لیے تھے اس لئے انہوں نے پنجاب کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مختلف انداز میں دیکھا اور تجزیہ کیا ابھی انگریزوں کو پنجاب میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوگئی، اس کے اثرات پنجاب پر بھی ہوئے لیکن ان بغاوتوں کو آسانی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ لیکن جب کمپنی کی فوج نے وہلی کا محاصرہ کیا تو اُن کی فوج میں اکثریت پنجابیوں کی تھی ان ہی کی مدد سے وہلی پر قبضہ ہوا اور جنگ آزادی کا خاتمہ ہوا۔ چونکہ اس جنگ میں شمالی ہندوستان کے فوجیوں نے حصہ لیا تھا۔ اس لئے انگریزی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی فوج میں ان کے بجائے پنجابیوں کو ترجیح دے چنانچہ انہوں نے پنجابیوں کو مارشل دیس قرار دے کر فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں نے پنجابی فوجیوں کو اپنی توسیع سلطنت کے لئے پوری طرح سے استعمال کیا۔ یہ انگریزوں کے لئے برما، ملایا، افغانستان، اور افریقہ کے ملکوں میں بھی لڑے اور جانیں دیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں پنجاب کے جاگیرداروں کی مدد سے گاؤں اور دیہاتوں کے نوجوانوں کو زبردستی فوج میں داخل کرایا۔ اور انہیں توپوں کی خوراک بنا کر اپنے مقاصد حاصل کئے۔

انگریزی دور کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ ان کے دور میں پنجاب میں مذہبی فرقہ پرستی اور مذہبی انتہا پسندی کی ابتداء ہوئی، 1813ء عیسوی میں کمپنی کی جانب سے عیسائی مشنریوں کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ ہندوستان میں جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ خاص طور سے عیسائی مشن والوں نے پنجاب میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ انارکلی بازار میں عیسائی مبلغ لوگوں کو اکٹھا کر کے اپنے مذہب کی خوبیاں بتاتے تھے۔ ان تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ تشویش ہوئی کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے اور حکومت اُن کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ چونچہ ردِعمل کے طور پر ہندوؤں میں آریا سماج کی تنظیم کا آغاز ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں میں مذہبی شناخت کو مضبوط کیا جائے اس مقصد کے لئے جگہ جگہ

اپنے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ مسلمانوں میں بھی اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور حمایت اسلام نامی تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت اسکول اور کالج کھولے گئے۔

ان تینوں مذاہب کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے عام لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوئے اس مرحلے پر مناظروں کا آغاز ہوا۔ ان مناظروں میں عیسائی مسلمان اور ہندو مذہبی علماء شریک ہوتے تھے، مناظرے کا اعلان کیا جاتا تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو جاتی تھی۔ لیکن ان مذہبی عالموں کے درمیان کوئی عالمانہ بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ لطیفوں اور جملہ بازی سے ایک دوسرے کو شکست دی جاتی تھی اور آخر میں ہر مذہبی جماعت اپنے کامیاب ہونے اور مخالف کو شکست دینے کا اعلان کر دیتی تھی۔ ان مناظروں کی وجہ سے لوگوں میں مذہبی شناخت کا جذبہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی میں یہ احساس بھی کہ ان کا مذہب سچا ہے۔ اور جب تبلیغ کے ذریعے تبدیلیِ مذہب پر زور دیا گیا تو اس نے لوگوں میں تناؤ پیدا کر دیا۔

اس لئے خاص بات یہ ہے کہ یہ مذہبی سرگرمیاں پنجاب کے صوبے میں زیادہ ہوئیں اور انہیں نے اس صوبے میں مذہبی انتہا پسندی کو پیدا کیا۔

بلند اقبال

پنجاب کو سیاست میں کافی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے اس کی سیاست کس طرح حالات کے تحت تبدیل ہوئی اور پاکستان بننے سے پہلے تحریک آزادی میں اس کا کیا کردار تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی

جب ہندوستان میں تحریک آزادی کا آغاز ہوا اور مختلف سیاسی جماعتیں بنیں جن میں کانگریس اور مسلم لیگ شامل ہیں۔ پنجاب کی سیاست میں انگریزی دور حکومت میں جس شخصیت کا اہم کردار رہا تھا۔ وہ فضل حسین کی ہے جنہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ترقی کے لئے اہم اقدامات کئے۔ ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا لیکن اپنی ذہانت اور صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد انہوں نے سیاسی مقام حاصل کر لیا اور پنجاب قانون ساز اسمبلی کے رُکن بن

گئے۔ جب وہ صوبے کے وزیر تعلیم ہوئے تو انہوں نے خصوصیت سے مسلمان طبقہ کی تعلیمی ترقی کے لئے کئی اقدامات اٹھائے انہوں نے مسلم لیگ کی سیاست کو پنجاب سے دور رکھا۔ وہ پنجاب کو ہندوستان کی سیاست اور اس کے تسلط سے آزاد رکھنا چاہتے تھے جب تک وہ زندہ رہے اس وقت تک پنجاب میں مسلم لیگ اور جناح صاحب کو قدم جمانے کا موقع نہیں ملا۔ 1936ء میں ان کی وفات کے بعد یہاں کی سیاست میں مسلم لیگ کو مواقع ملے۔ پنجاب میں سر فضل حسین کی خدمات کا پوری طرح اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کا تعلق یونینسٹ (Unionist) پارٹی سے تھا جس میں ہندو سکھ اور مسلمان شامل تھے۔ اس لئے یہ ایک سیکولر پارٹی تھی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے بالاتر تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں اس لئے سر فضل حسین کو بحیثیت سیکولر رہنما کے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اگر چہ پنجاب میں مسلم لیگ نے اپنے اثر ورسوخ کو بڑھا لیا تھا لیکن اس کے باوجود جب 1940ء میں لاہور میں ایک قرارداد پاس ہوئی تو سر سکندر حیات نے جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعظم تھے یہ اعلان کر دیا تھا کہ مسلم لیگ پنجاب سے ہاتھ اُٹھا لے۔ لیکن جب سر سکندر کی وفات کے بعد حالات میں تبدیلی آئی اور پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں کو یہ احساس ہوا کہ اب پاکستان کا بننا ناگزیر ہے تو انہوں نے راتوں رات یونینسٹ پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1946ء کے الیکشن میں پنجاب میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس الیکشن میں صرف 25 فیصد لوگوں کو ووٹ دینے کا حق تھا جب کہ عوام کی اکثریت اس حق سے محروم تھی۔

پاکستان بننے کے بعد تاریخ میں پنجاب کے صوبے کو خاص اہمیت دینے کی کوشش کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جدوجہد آزادی میں پنجاب نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا ہے۔ اس لئے پنجاب کے حکمران طبقوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پاکستان کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا کردار تشکیل دے کر اس پر حکومت کرنے کا حق ثابت کرے۔ چنانچہ اس کی ابتداء یہ ہوئی کہ اقبال کو بانیانِ پاکستان کے حصہ اول میں شامل کر لیا گیا اور جس کی یہ دلیل دی گئی کہ

انہوں نے اپنے خطبہ آلہ آباد میں یہ کہا تھا کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کو یا تو برطانوی حکومت کے اندر یہ اس سے باہر علیحدہ اور آزاد کر دیا جائے۔ جب اقبال پاکستان کے تصور کے خالق ہوئے تو جناح صاحب کی شخصیت دوسرے نمبر پر آئی کہ جنہوں نے اقبال کے خواب کو پورا کیا۔ اس نئی تاریخ کی تشکیل کی وجہ سے پنجاب نے پاکستان بنانے اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے میں اپنے حصے کو نمایاں کر کے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے صوبے پنجاب کو ملک کے دوسرے صوبوں پر فوقیت حاصل ہوگئی۔

بلند اقبال

اب ہم یہاں پر برصغیر کی تقسیم اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے تعلقات پر بات کرنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر کی تقسیم کے وقت بنگال اور پنجاب کو بھی مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی تھی کہ کانگریس ایک طرف تو مذہبی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم نہیں چاہتی تھی مگر دوسری جانب بنگال اور پنجاب کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا کہنا تھا کہ بغیر کلکتہ شہر کے مشرقی بنگال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے وہ آزاد بنگال کے حامی بھی ہوگئے تھے۔

لیکن جب پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوا تو ان دونوں کے درمیان توازن رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ کیونکہ بنگالی اپنی زبان اور کلچر کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے صوبوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے ہاں جاگیردارانہ کلچر کا تسلط نہیں تھا۔ اس لئے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ سیاست میں آ گئے تھے اور ان کے ہاں جمہوری سوچ کا اثر زیادہ تھا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد مسلم لیگ نے کراچی کو دارالحکومت بنایا اور بنگالیوں کو ریاستی اداروں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے نشستیں نہیں دی گئیں لیکن بنگالیوں نے ابتداء ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے

حقوق کی قربانی دے کر پاکستان کے ساتھ اپنے رشتے مضبوط رکھیں۔

جب پاکستان کا پہلا دستور 1956ء میں بنایا گیا تو اس میں مشرقی پاکستان کی آبادی کی اکثریت کو اس کے حقوق سے محروم رکھا گیا مثلاً یہ کہا گیا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ ہے۔ اس لئے اس کے نمائندے بھی زیادہ ہوں گے۔ لہٰذا مساوات (Parity) کا اصول اختیار کیا گیا کہ دونوں صوبوں کے نمائندے برابر ہوں گے۔ اس کے بعد بنگال کے اس مطالبے پر بھی توجہ نہیں دی گئی کہ بنگالی کو بھی قومی زبان ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ون یونٹ کے اصول کو اپنایا گیا تا کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبے مل کر مشرقی پاکستان کا مقابلہ کریں۔ یہ عمل خصوصیت سے سندھ بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں غیر مقبول ہوا۔ لیکن اس ساری صورتحال میں پنجاب نے پاکستان کی ریاست اور اس کے اداروں پر پورا پورا تسلط قائم کر لیا۔ فوج اور نوکر شاہی میں پنجاب کے لوگوں کا قبضہ تھا۔ صنعت میں بھی پنجابی صنعتکار چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے سرکاری عہدیداروں اور فوج نے بطور کالونی سمجھا اور ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس ردعمل میں بنگالی سیاست میں انقلابی نظریات آئے اور ایسے رہنما پیدا ہوئے کہ جنہوں نے ترقی پسند سیاست کو آگے بڑھایا۔ ایوب خان کی امریت کے زمانے میں انہوں نے جمہوریت کے لئے جدوجہد کی اور انتخابات میں فاطمہ جناح کو ووٹ دے کر اپنے جمہوری نظریات کا اظہار کیا۔

بلند اقبال

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو کس نے توڑا؟ مجیب الرحمٰن، یحییٰ یا بھٹو نے کون اس کا ذمہ دار ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ کو اکثر شخصیات کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخصیات تاریخ کو بنانے یا بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لئے جب مشرقی پاکستان

کے ٹوٹنے کو دیکھا جاتا ہے تو اس میں بھی ہم شخصیات کے عمل کو دیکھتے ہیں لیکن شخصیات کے عمل کو دیکھنے کے لئے اُن سیاسی اور سماجی حالات کو اور اُن قوتوں کو دیکھنا لازمی ہے کہ جنہوں نے شخصیات کو باعمل بنانے میں حصہ لیا۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا سوال ہے تو شروع ہی سے بنگالیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا۔ اور ان کے حقوق کو پامال کیا گیا تھا۔ اس لئے جب 1956ء کی جنگ کے دوران خود کو بغیر کسی دفاع کے پایا تو ان میں یہ احساس ہوا کہ وہ اس قابل ہیں کہ علیحدہ رہ کر بھی اپنا دفاع کر سکتے ہیں اور اپنی معاشی ضرورت کو بھی پورا کر سکتے ہیں۔ 1971ء کے الیکشن میں عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کی مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو مکمل اکثریت نہیں ملی تھی اس لئے اصولاً حکومت بنانے کا حق عوامی لیگ کو تھا۔ مگر مغربی پنجاب کے جاگیردار سیاستدان اس بات پر تیار نہیں ہوئے کہ بنگالیوں کی حکومت کو تسلیم کریں۔ مجیب الرحمٰن کا کردار ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے حکومت بنانے کا اسے حق تھا مگر جب اسے یہ نہیں دیا گیا تو اس کے لئے علیحدگی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ بھٹو اور ان کے پس پشت جاگیردار سیاست دان اس پر تیار نہیں تھے کہ متوسط طبقے کے بنگال لیڈروں کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیں۔ اس جھگڑے میں فوج نے مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کا ساتھ دیا اور بنگال میں فوجی ایکشن کر کے بنگالی دانشوروں، طالب علموں اور عام لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔ بنگالیوں کو کچلنے کے سلسلے میں وہاں مقیم پاکستانیوں نے الشّمس اور البدر بنا کر فوج کا ساتھ دیا۔ لہٰذا جب یہ خونریز ڈرامہ جاری تھا تو اس وقت بدقسمتی سے مغربی پاکستان کے لوگوں نے فوجی ایکشن کی حمایت کی اور بنگالیوں کے قتل عام پر کسی دُکھ کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ہاں چند افراد ضرور تھے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تو یہ پاکستان کے غدار کہلائے۔

مشرقی پاکستان سے جب کوئی سبق نہیں سیکھا گیا۔ بنگالیوں کے قتل عام پر خاموشی اختیار کی گئی۔ محمود الرحمٰن کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد لوگوں کی ڈائریوں خطوط اور یاداشتوں سے فوجی ایکشن کے دوران جو بھی بیتا تھا اس کے سامنے آنے کے بعد بھی ریاست نے جرائم کا کوئی اعتراف نہیں کیا یہاں تک کہ درسی کتابوں میں اس واقعے کا ذکر تک نہیں جب کوئی معاشرہ

دہشت گردی اور قتلِ عام کو تسلیم کر لیتا ہے تو یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے اور لوگ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسا کہ اس وقت پاکستان میں ہو رہا ہے۔ دہشت گردی کے واقعات پر خاموشی اختیار کر کے اسے بھلا دیا جاتا ہے۔ بلوچستان میں ایک بار پھر مشرقی پاکستان کے طور طریقہ کو دہرایا جا رہا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جتنا قوت کو استعمال کریں گے اسی قدر اس کی مزاحمت ہوگی۔

بلند اقبال

وہ کونسے ذرائع ہیں کہ جن کو اختیار کرتے ہوئے پنجاب نے اپنی برتری قائم رکھی ہوئی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پنجاب کی آبادی اکثریت میں ہے۔ اس لئے جی ایم سید نے ایک بار کہا تھا کہ چھوٹا صوبہ ہونے کی وجہ سے سندھ کے لئے جمہوریت بے کار ہے۔ کیونکہ اکثریتی صوبے کی وجہ سے پنجاب ہمیشہ سیاست پر حاوی رہے گا۔ لہٰذا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اکثریت بھی آمرانہ طور طریقے اختیار کر لیتی ہے اور اقلیتوں کے حقوق کو پامال کرتی ہے۔ دوسرے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ریاسی اداروں پر بھی پنجاب کا قبضہ ہے۔ بہتر ہے پنجاب نظریہ پاکستان کا چمن بھی ہے۔ نظریہ پاکستان کی یہ اصلاح لچکدار ہے اس میں دو قومی نظریہ قائداعظم محمد علی جناح اور اسلام سبھی آ جاتے ہیں۔ اور نظریہ پاکستان کو مقصد قرار دے کر اس پر تنقید کرنا ایک طرح سے جرم ہے۔ ریاست کی جانب سے جس قوم پرستی کی تبلیغ کی جاتی ہے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ صوبائی شناخت کو ختم کر کے لوگ قومی شناخت کو اختیار کر لیں اور ان نظریات کی تبلیغ کے لئے نصابی کتابوں کو استعمال کیا جاتا ہے کہ نصابی کتابوں کا مواد قومی کری کلم (Cirriculum) بورڈ تجویز کرتا ہے۔ صوبوں کو اپنی نصابی کتابیں تیار کرنے کے کم سے کم اختیارات ہیں۔ کیونکہ اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں صوبے نظریہ پاکستان

سے اختلاف کردہ مواد کو شائع نہ کر ڈالیں۔

بلند اقبال

پنجاب کی سیاست نے کس طرح چھوٹے صوبوں میں بے چینی پیدا کی اور پھر اُن میں علیحدگی کے جذبات اُبھرے؟

ڈاکٹر مبارک علی

چھوٹے صوبوں میں پنجاب کے خلاف مخالفانہ جذبات اس لئے پیدا ہوئے کیونکہ ریاستی اداروں میں پنجاب انہیں ان کا حق دینے پر تیار نہیں ہے۔ چھوٹے صوبوں میں اب متوسط طبقے کا پھیلاؤ ہو رہا ہے جنہیں حکومت کی ملازمتیں بھی درکار ہیں اور ریاستی اداروں میں شمولیت بھی لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ جمہوری حکومت ہو یا فوجی امریت ان دونوں صورتوں میں پنجاب ہی کا تسلط رہتا ہے۔ ان چھوٹے صوبوں کے سامنے بنگلہ دیش کی مثال موجود ہے کہ جس نے علیحدہ ہو کر زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لئے جب تک پنجاب چھوٹے صوبوں کو ان کا حق نہیں دے گا مخالفت کے اور علیحدگی کے جذبات پیدا ہوتے رہیں گے۔

بلند اقبال

ہندوستان میں زرعی اصلاحات ہوتی ہیں لیکن پاکستان میں نہیں' کیوں؟ پنجاب کیوں کوشش کرتا ہے کہ وفاق دوسرے صوبے کے وسائل لے کر انھیں اپنی مرضی سے استعمال کرے۔ کیونکر وفاق پر پنجاب کا قبضہ ہے۔ اس لئے وہ ان وسائل کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور یہی جہ ہے کہ سندھ، بلوچستان اور پختونخواہ شکائتیں کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

تقسیم کے فوراً بعد پنجاب میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ یہاں زرعی اصلاحات کی

جائیں لیکن دولتانہ حکومت نے اس پر عمل نہیں کیا۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے جاگیرداری کے تحفظ کے لئے انجمن بنائی اور شرعی اعتبار سے اسے جائز قرار دیا اور اس کے بعد زرعی اصلاحات کی جو بھی کوششیں ہوئی وہ ناکام رہیں۔ پاکستان کے ایک وزیراعظم ظفراللہ خان جمالی نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ پاکستان میں اب کوئی زرعی اصلاحات نہیں ہوں گی۔ اس لئے ہمارے ملک میں عوامی جمہوریت کی جگہ جاگیردارانہ جمہوریت ہے۔ پارلیمنٹ میں جاگیرداروں اور پیروں کی اکثریت ہے بلکہ جو صنعتکار ہیں وہ بھی ذہنی طور پر جاگیردارانہ کلچر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

صوبہ پنجاب کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جنوبی پنجاب جو جاگیرداروں، جعلی پیروں اور سجادہ نشینوں کی گرفت میں ہے اس لئے سماجی اور ثقافتی طور پر بے انتہا پسماندہ ہے۔ پسماندگی کی وجہ سے مذہب کا غلبہ ہے۔ اب یہاں سرائیکی صوبہ کا مطالبہ بھی زور پکڑ رہا ہے۔ لیکن چھوٹے صوبے کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ ان کے سماج میں جاگیردار اور پیر بااثر لوگوں میں سے ہیں اس لیے سندھ میں آج بھی حکومت کے سربراہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرائیکی علاقے میں بھی جاگیردار اور پیر سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ بلوچستان اور پختونخواہ میں قبائلی سردار طاقتور ہیں۔ اس لئے اگرچہ پنجاب کے تسلط سے آزاد بھی ہوگئے تو اپنے ہی لوگوں کے استعمار کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا پنجاب اور چھوٹے صوبوں کے لئے حل یہ ہے کہ اس بدعنوان اشرافیہ سے چھٹکارا پایا جائے اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق دیئے جائیں۔ جن میں تعلیم، صحت، روزگار اور رہائش شامل ہیں۔

بلند اقبال

اگر پنجاب چھوٹے صوبوں اور ان کی سیاست سے اس قدر بیزار ہے تو پھر کیا یہ حل نہیں کہ ان سب سے علیحدہ ہو کر آزاد ہو جائے؟

ڈاکٹر مبارک علی

پنجاب کے لئے ایک آزاد حیثیت سے رہنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس جو ریاستی ادارے ہیں ان کے اخراجات کو پنجاب سے پورا نہیں کیا جا سکتا دوسرے یہ کہ پنجاب کے پاس کوئی ساحلی شہر بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کی تجارت بھی محدود ہو جائے گی تیسرے اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ اگر آبادی کی منتقلی ہوئی تو پنجاب کے لوگ جو دوسرے صوبوں میں آباد ہیں ان کو کس طرح سے منتقل کیا جائے گا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر مشرقی اور مغربی پنجاب مل جائیں تو اس صورت میں اس کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہوگی لیکن اس مرحلے پر دونوں پنجابیوں کا آپس میں ملنا اس لئے مشکل نظر آتا ہے کہ صدیوں ساتھ رہنے کے باوجود برصغیر کی تقسیم نے دونوں جانب جو زخم چھوڑے ہیں۔ ان کو بھرنے میں وقت لگے گا۔ اگرچہ دونوں کی زبان پنجابی ہے مگر ان کے رسم الخط جدا جدا ہیں اب مشرقی پنجاب کی پنجابی میں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ آ گئے ہیں۔ جبکہ پاکستانی پنجاب نے فارسی کا اثر قبول کر لیا ہے۔ مذہب کی بھی وجہ سے دونوں کا آپس میں ملنا ایک مشکل امر ہے۔ اس کے لئے ذہن ترقی اور رواداری کے فروغ کی ضرورت ہے اس لئے ہم ان امکانات کو دیکھتے ہیں کہ پنجاب پاکستان کے دوسرے صوبوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا حل یہ ہے کہ پنجاب کے حکمران طبقوں کو حالات کی سنجیدگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ریاست کی ساخت کو بدلنا ہوگا۔ ریاستی اداروں میں چھوٹے صوبوں کی شمولیت کرنا ہوگی۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ صوبائی زبانوں کو بھی قومی زبانیں بنا کر ان کو ترقی دینا ہوگی اور ریاست کو مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار بنا کر غیر مذہبی اقلیتوں کو تحفظ دینا ہوگا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آج کی ہونے والی گفتگو کا بہت بہت شکریہ۔ آج کی گفتگو کے نتیجے

میں بہت سے نئے خیالات سامنے آئے ہیں جن کی مدد سے ہم حالات کو سمجھیں گے اور ان کو ٹھیک کرنے کی طرف بھی توجہ دیں گے۔اس پروگرام میں ہم پاکستان کے دوسرے صوبے پر بھی گفتگو کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆.....☆.....☆

3-بلوچستان

بلند اقبال

آج ہم صوبہ بلوچستان کے بارے میں گفتگو کریں گے جو رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے سب سے کم۔ یہاں خواندگی کی شرح بھی دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مردوں میں 10% (دس فیصد) اور عورتوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ بچوں کی شرح اموات بھی سب سے زیادہ ہے۔ معاشی لحاظ سے بھی پسماندہ ہے۔ آج ہم اس کی قدیم تاریخ اور تاریخ کے مختلف مراحل میں اس کا کردار اور تقسیم کے بعد پاکستانی ریاست سے اس کے تنازعات۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا بلوچستان پاکستان میں رہ کر اپنے حقوق حاصل کر سکے گا اور کیا جیسا کہ یہاں کی کچھ قوم پرست جماعتوں کا خیال ہے کہ کیا بلوچستان اپنا مقام حاصل کر سکے گا۔ ان اہم موضوعات میں ہم نے آج ایک بار پھر ڈاکٹر مبارک علی کو دعوت دی ہے کہ وہ ان موضوعات پر بات کریں۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس بار بلوچستان پر بولنے کا موقع دیا۔ سب سے پہلے ہم بلوچستان کی پرانی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔ کیونکہ جب ہم آج کے بلوچستان کو دیکھتے ہیں تو یہ بنجر اور بے آب و گیاہ نظر آتا ہے لیکن قدیم دور میں ایسا نہیں تھا۔ آثارِ قدیمہ کی دریافتوں سے اس کی تاریخی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً وادیِ سندھ کی تہذیب جو مشرقی افغانستان سے شروع

ہوئی اور بلوچستان میں آ کر اس نے پختہ شکل اختیار کی۔ مہرگڑھ کی کھدائی کے بعد بلوچستان کی تاریخ پتھر کے دور تک چلی گئی ہے۔ یہاں پر جو شواہد ملے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غذاء اور شکار کے زمانے میں بھی انہوں نے کاشت شروع کر دی تھی۔ کیونکہ یہاں سے کپاس کے جلے ہوئے دانے ملے ہیں۔ مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا ان کے ساتھ ان کے استعمال کی اشیاء بھی دفن کر دی جاتی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان میں دوبارہ سے زندہ ہونے کا عقیدہ تھا۔ یہاں سے زیورات بھی ملے ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ ان میں خوبصورتی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ میرا وہاں جانے کا اتفاق ہوا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ فرانسیب آثار قدیمہ ایک ٹیلے پر کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔ جب میں وہاں گیا اور ان سے بات چیت کی تو انہوں نے بتایا کہ وہ یہ تحقیق کر رہے ہیں کہ مکران اور خلیج فارس کے درمیان ثقافتی رشتوں کی نوعیت کیا تھی۔ کھدائی کے دوران انہوں نے کافی اشیاء دریافت کی تھیں لیکن وہ اپنی تحقیق کو مکمل نہ کر سکے اور بلوچستان کے حالات کی وجہ سے اسے ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ لہٰذا اب بھی بلوچستان میں بہت سے مقامات ہیں اور ان کی کھدائی کی جائے تو ہمارے تاریخ کے علم میں بہت اضافہ ہوگا۔ اس سفر کے دوران جب میں تربت سے گوادر گیا تھا یہ بھی بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ چونکہ راستے میں کچے پہاڑوں کو پانی کے بہاؤ نے کاٹ کر عجیب وغریب شکلیں دیں ہیں۔ شاید کبھی یہاں سمندر بہتا ہوگا۔ ان شکلوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی مجسمہ تراش نے تراشا ہو۔ گوادر کی بندرگاہ جو کبھی مسقط کے پاس تھی اب یہ پاکستان کے پاس ہے۔ اب یہ بندرگاہ چین کے تعاون کے بعد بہت اہم ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسے بلوچستان کے لوگوں کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔

مکران کے علاقے کی بھی اپنی اہمیت ہے اس کی فتح کے بعد ہی عربوں کو سندھ پر حملہ کرنے میں آسانی ہوئی بعد میں مکران اس لئے بھی مشہور ہوا کہ یہاں زنجبار سے افریقیوں کو بطور غلام لایا جاتا تھا اور پھر انہیں سندھ میں فروخت کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کی نسل سندھ میں مکرانی کہلاتی ہے۔

اب ہم مکران میں بسنے والوں کے متعلق بات کرتے ہیں۔ یہ بلوچستان کے علاوہ ایران میں بھی ہیں۔ سندھ کے بالائی حصے میں بھی یہ آباد ہیں اور جنوبی پنجاب میں بھی ان کی بستیاں ہیں۔ اس طرح سے یہ بکھرے ہوئے ہیں اور متحد نہیں ہیں۔ ایران میں بھی ان کے حکومت سے حالات کشیدہ رہتے ہیں۔ بلوچوں کے بعد دوسرا نسلی گروپ پشتونوں کا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں پشین اور چمن سے ملحقہ علاقوں کو افغانستان سے لے کر بلوچوں میں شامل کیا گیا۔ پشتونوں کا علاقہ چونکہ زرعی بھی ہے اس لئے معاشی طور پر یہ خوشحال ہیں، لیکن ان کے تعلقات افغانستان اور پختونخواہ سے زیادہ قریبی ہیں۔ اس کے بعد یہاں ہزارہ قبائل کے لوگ بھی آباد ہیں۔ اور منگول نسل سے ہیں۔ اور شیعہ مسلک کے پیروکار ہیں حال ہی میں مذہبی انتہا پسندی کی وجہ سے ہزارہ نسل کے لوگ کا قتل عام ہوا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ریاست ان کے تحفظ میں ناکام رہی۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹا گروپ براجوی لوگوں کا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق دراوڑی زبانوں سے ہے۔ یہ تمام گروپ قبائل کی شکل میں آباد ہیں اور اپنی بقا کی شناخت پر فخر کرتے ہیں۔

بلوچستان کی جو تاریخ برطانوی دور یا پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد لکھی گئی اس کا مرکز قبیلے کے سردار ہیں۔ لہٰذا اس تاریخ میں ہمیں قبائل جنگوں اور لڑائیوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر بلوچ عوام کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ دراصل برطانوی دور میں بلوچ سرداروں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی اور وہ شخص جس نے سرداروں کو طاقتور بنایا اس کا نام (SANDMAN) تھا۔ اس نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ بلوچ قبائل سے جنگ کرنے میں حکومت کا خرچہ بھی ہوگا اور قتل و غارت گری بھی ہوگی۔ اس لئے مناسب ہے ہے کہ قبائلیوں کے سرداروں سے دوستانہ حالات بنائے جائیں۔ ان کے وظائف مقرر کئے جائیں انہیں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ اس لئے (Levis) کا ادارہ قائم کر کے اسے ان کے ماتحت کر دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ سردار کو قابو میں رکھ کر اس کے قبیلے کو بھی وفادار رکھا جا سکے گا۔ اس میں برطانوی حکومت کو کامیابی ہوئی۔

پاکستان بننے کے بعد بھی یہ پولیسی جاری رہی اور پاکستانی حکومت نے ان مراعات کو جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سردار اپنے قبیلے کے لوگوں پر مکمل طور پر حکومت کرتے ہیں جیسا کہ خبروں میں آ جاتا ہے کہ ان میں سے بعض نے نجی جیل بنا رکھے ہیں جہاں مخالفوں کو قید میں بھی رکھا جاتا ہے اور اذیتیں بھی دی جاتی ہیں جیسا کہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ حال ہی میں ایک قبیلے کے سردار نے پانچ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا ہے اور جب اس کی مذمت کی گئی تو اس کا کہنا تھا کہ یہ تو بلوچوں کی روایت ہے کاروکاری اور عزت کے نام پر عورتوں کے قتل کو روایت کا نام دیا جاتا ہے اور اس بنا پر یہ قانون سے بالاتر ہوتے اور قانون سے سزا بھی نہیں پاتے۔ ہر آنے والی حکومت اپنی مرضی کے سرداروں کو خرید کر انہیں حکومت کا حصہ بنا دیتی ہے۔ یہ خیال کئے بغیر کہ بلوچ لوگوں کے ان کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔

بلند اقبال

اس تاریخی پس منظر کے بعد اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ بلوچستان کیونکہ پاکستان کا حصہ بنا؟ کیا اس میں پاکستانی ریاست کا کوئی جبر تھا اور کیوں پاکستانی ریاست نے سرداری نظام کو برطانوی حکومت کی بنیادوں پر قائم رکھا؟

ڈاکٹر مبارک علی

یہ برطانوی حکومت کے مفاد میں تھا کہ سرداروں کو اختیارات دے کر اور فاصلہ انہیں مضبوط بنا کر قبائل کو قابو میں رکھا جائے۔ مناسب تو یہ تھا کہ پاکستانی حکومت اس راویت کو تبدیل کرتی اور بلوچ قبائل کو سرداروں کی گرفت سے نکال کر آزاد کرتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور پاکستان کی ہر آنے والی حکومت نے اپنے اپنے سرداروں کی مدد سے بلوچستان پر حکومت کی۔

لیکن پاکستان اور قلات کی ریاست میں ابتدائی دور ہی میں تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ انسٹیڈنٹ رکٹ میں مقامی ریاست کے حکمرانوں کو یہ آزادی دی گئی تھی۔ کہ وہ انڈیا یا پاکستان کے ساتھ مل جائیں لیکن کچھ ریاستیں ایسی تھیں جو آزاد ہونا چاہتی تھیں ان ہی میں

سے ایک حیدر آباد دکن کی ریاست تھی۔ لیکن ہندوستان نے آرمی ایکشن کے ذریعے اس پر قبضہ کر لیا یہی صورتحال قلات ریاست کی تھی، جو پاکستان میں شامل ہونے کی بجائے آزاد رہنا چاہتی تھی مگر یہاں بھی فوجی ایکشن کے ذریعے قلات کی ریاست کا خاتمہ کر کے اسے پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان کا یہ عمل درست تھا اور کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ وہاں ریفرنڈم کرا کے ان کی رائے لی جائے۔

بلند اقبال

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم کو قلات کے مسئلے سے بہت دلچسپی تھی اور ایسا تو نہیں کہ شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنا کافی وقت زیارت میں گزارا۔

ڈاکٹر مبارک علی

یہ صحیح ہے کہ قائد اعظم کو ریاست قلات سے دلچسپی تھی بلکہ تقسیم سے پہلے وہ اس کے وکیل بھی رہے تھے۔ لیکن بحیثیت گورنر جنرل کے ان کا خیال تھا کہ قلات کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ زیارت میں ان کے رہنے کی وجہ ان کی بیماری تھی سیاست نہیں۔

اب یہ سوال کہ سرداروں کی اہمیت آخر پاکستان بننے کے بعد بھی کیوں برقرار ہے۔ یہاں میں اپنا ایک واقعہ بتانا چاہوں گا کہ جب میرا ایک بار گوادر جانا ہوا اور وہاں نوجوانوں سے بات چیت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بلوچستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ سرداروں کی گرفت میں رہے گا۔ اور نہ ہی بلوچ نیشنل ازم ابھر سکتا ہے کیونکہ سردار اپنے اپنے قبائل کو اپنے دائرہ اثر میں رکھیں گے اور انہیں قوم کے نام پر متحد نہیں ہونے دیں گے۔ اس پر ایک نوجوان نے اٹھ کر یہ کہا کہ عملی طور پر ہم سرداروں کے اس لیے محتاج ہیں کہ وہ ہمارے ہر کام میں مدد کرتے ہیں۔ یعنی روزگار دلانا ہو پولیس سے چھٹکارا دلانا ہو۔ تعلیم کے اداروں میں داخلے کا سوال ہو تو سردار ہی ہماری مدد کو آتا ہے۔ اگر یہاں پاکستانی ریاست ہوتی اور ہمارے بنیادی مسائل حل کرتی تو ہم سرداروں سے نجات حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن جب ریاست ہی

نہیں تو پھر ہم سرداروں کے علاوہ کہاں جائیں۔ بدقسمتی سے جب پاکستانی ریاست بلوچستان گئی تو وہ عوام دوست کی بجائے ایک جابر کی شکل میں سامنے آئی جس کے اداروں میں اس کا بہت کم حصہ تھا۔ اس لئے ریاست اور بلوچوں کے درمیان تعلقات ابتداء ہی سے کشیدہ رہے اور کشیدہ ہیں۔

بلند اقبال

اب ہم ایوب خان کی آمریت کے دوران بلوچستان میں جو پالیسی اختیار کی گئی اس پر کچھ معلومات چاہیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی

اگرچہ ایوب خان کی مزاحمت کے دوران دوسرے صوبوں میں بھی مزاحمت ہوئی لیکن بلوچستان میں مزاحمت نے مسلّم شکل اختیار کر لی۔ کیونکہ بلوچ فوج سے جنگ نہیں کر سکتے تھے اس لئے یہ پہاڑوں پر چلے گئے ہیں اور وہاں سے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ پاکستان حکومت نے روزی خان جو اس مزاحمت کے سربراہ تھے ان سے اور ان کے ساتھیوں سے صلح کی اور کہا جاتا ہے کہ بلوچوں کو یقین دلانے کے لئے قرآن شریف پر حلف اٹھایا گیا لیکن جب روزی خان اور اس کے ساتھی پہاڑوں سے اترے تو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ روزی خان کو حیدر آباد جیل میں رکھا گیا جبکہ اس کے بیٹوں کو سکھر جیل میں ان پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا اور روزی خان کے بیٹوں کو پھانسی دے دی گئی۔ یہاں پر ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ جب ریاست کی جانب سے لوگوں کو غدار قرار دیا جاتا ہے اور اس جرم میں پھانسی دی جاتی ہے تو اس عمل سے مزاحمت کی تحریک ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے پھانسی پانے والے شہید اور ہیرو مل جاتے ہیں۔ جو لوگوں میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستانی ریاست پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے مخالف سیاستدانوں کو برابر غدار قرار دیتی رہی جیسے خان غفار خان، جی ایم سیّد اور آگے چل کر شیخ مجیب الرحمٰن بھی۔ روزی خان کو

85 سال کی عمر میں پھانسی دی گئی، بلوچوں کی تاریخ میں یہ وہ زخم ہیں جو اب تک ہرے ہیں اور جن کا درد وہ اب تک محسوس کرتے ہیں۔

بلند اقبال

ذرا یہ بتائیں کہ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں بلوچستان پر کیا بیتی؟

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان ریاست کی جانب سے بار بار بلوچستان کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کو توڑا گیا اور جو لوگ صوبے کے حقوق کی آواز بلند کرتے انہیں سخت سزائیں دیں گئیں۔ اس لئے بلوچوں اور پاکستانی اسٹیٹ کے درمیان تعلقات اچھے نہیں رہے۔ اس ضمن وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت قومی ریاست پاکستان نے اپنے فرائض پورے نہیں کئے۔ کیونکہ قومی ریاست کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ بکھری ہوئی جماعتوں اور گروپوں کو متحد کر کے انہیں آپس میں ملاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ انہیں علیحدہ کر کے ان کے ساتھ مخالفانہ رویہ اختیار کیا جائے۔

اب یہاں سیاست کے بارے میں کچھ تھیوریز بھی ہیں جو بلوچوں کے مسئلے کو سمجھنے میں مدد دیں گی کیونکہ بلوچ کی ایک بڑی تعداد میں ہیں۔ اس لئے شاہ کے زمانے میں ایران کو خطرہ تھا کہ اگر پاکستان کے بلوچوں میں مزاحمت کی تحریک ابھرتی ہے تو اس سے ایرانی بلوچ بھی متاثر ہوں گے اور یہ دونوں مل کر ایک آزاد بلوچستان کے قیام کے لئے جدوجہد کریں گے۔ پاکستان کی صورتحال یہ تھی کہ 1971 کی جنگ کے بعد اور بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد یہ خطرہ تھا کہ اگر بلوچستان آزاد ہو جاتا ہے تو اس صورت میں پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اس لئے وہ بلوچستان میں کسی بھی مزاحمتی تحریک کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

بلند اقبال

بھٹو کے زمانے میں بھی بلوچستان کے ساتھ مخالفانہ رویہ کیوں رکھا گیا؟

ڈاکٹر مبارک علی

بھٹو کے زمانے میں مخالف رویہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں تھی اور سن ستر کی دہائی اس لئے مختلف تھی کیونکہ اس دور میں پوری دنیا میں انقلابی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں اور بلوچستان کے نوجوان بھی اس سے متاثر ہوئے اور پہاڑوں پر چڑھ کر گوریلا جنگ شروع کی۔ اس لئے حکومت ایران بھی پریشان ہوئی اور اس نے اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لئے حکومت پاکستان کی پوری امداد کی۔ بھٹو صاحب نے بلوچ سرداروں کو جن میں بزنجو وغیرہ شامل تھے غداری کے الزام میں حیدرآباد جیل میں بند کر دیا۔

اس کے بعد سے لے کر اب تک بلوچستان اور پاکستان کی ریاست میں تصادم اور کشمکش ہے۔ مشرف کے زمانے میں بھی فوج اور بلوچوں کی لڑائی جاری اور اس تصادم کے نتیجے میں نواب اکبر خان بگٹی مارے گئے۔ اب تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ نواب اکبر خان بگٹی ایک ظالم اور جابر سردار تھا جس کی اپنی نجی جیل تھی جو اپنے فیصلے کے پیش نظر لوگوں سے بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔ سیاست میں بھی کوئی اصول نہ تھے۔ جب ان کے مفادات ہوتے تھے تو ریاست سے مل جاتے تھے اور جب ضرورت ہوتی تھی تو مخالفت کا کردار ادا کرتے تھے۔ لیکن جس طرح سے ان کی موت واقعہ ہوئی اس نے ان کے پچھلے تمام گناہوں کو دھو دیا اور یہ بطور ہیرو بلوچ عوام کے سامنے آئے۔ اس لئے تاریخ کو ریاست ہی مسخ نہیں کرتی ہے۔ بلکہ سیاسی جماعتیں بھی یہ کام کر لیتی ہیں۔

اس وقت بلوچستان کا سب سے بڑا مسئلہ مسنگ پرسن یا گمشدہ افراد کا ہے یہ صورتحال اس لئے پیدا ہوئی کہ بلوچستان کے نوجوانوں میں جو سیاسی شعور آیا اس نے انہیں یہ موقع دیا کہ وہ اپنی تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کریں اور ماضی میں ان کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں ان کا جائزہ لے کر صوبے کے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد پاکستان فوج سندھ اور بلوچستان میں پیدا ہونے والی تحریکوں سے خوفزدہ تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ بنگلہ دیش وغیرہ کا واقعہ دوبارہ دہرایا جائے اس لئے

فوج اور جاسوسی اداروں کا تسلط بلوچستان پر بڑھ گیا گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ سیاسی کارکنوں کو اٹھا لیا جاتا تھا ان سے پوچھ گچھ ہوتی تھی انہیں اذیتیں دیں جاتی تھیں اور بعض حالات میں انہیں مار کر ان کی لاشیں پھینک دی جاتی تھیں۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب بھی ریاست جبر کی پالیسی کو اختیار کرتی ہے تو مزاحمت اور زیادہ گہری ہوجاتی ہے۔ گرفتار ہونے والے گمشدہ افراد کے خاندان اور قبیلوں کے لوگ اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔

بلند اقبال

بلوچستان میں اگر چہ معدنیات کی کافی کانیں ہیں لیکن ابھی نہ تو ان کا استعمال ہوا ہے اور نہ نہ عوام کی حالت بہتر ہوئی ہے اور اس پر بھی کچھ روشنی ڈالیے کہ گوادر کی بندرگاہ کی وجہ سے ایران ، افغانستان اور امریکہ سے پاکستان کے تعلقات میں جو تناؤ آیا ہے یہ ہمیں کس طرف لے جائے گا؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے صحیح کہا کہ بلوچستان میں معدنیات کی نشاندہی کی گئی ہے اور معدنیات کا اب تک استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور شاید ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اگر یہ معدنیات نکال لی جاتیں تو ان کا فائدہ بھی چند افراد کو ہوتا اور اب بھی اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ معدنیات کی کانوں کو غیر ملکی کمپنیوں کو ٹھیکے پر دے کر ان سے کمیشن وصول کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا ان معدنیات کو اسی وقت نکالنا چاہیے کہ جب بلوچستان میں عوامی نمائندوں کی حکومت ہو۔

اس وقت پاکستان میں گوادر کی بندرگاہ کی بڑی اہمیت ہوگئی ہے کیونکہ یہ چین کو دے دی گئی ہے تا کہ وہ اس کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کو استعمال کر لے۔ ہندوستان اور ایران دونوں اس کے مخالف ہیں۔ امریکہ پاکستان میں چین کے اس اثر و رسوخ کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا گوادر کی بندرگاہ پاکستان کی معاشی اور سیاسی صورتحال کو بدلے گی اور کیا اس

سے بلوچستان کی پسماندگی، افلاس اور غربت کا خاتمہ ہوگا۔ یہاں میں اپنا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوگا۔ 2007 میں جب میں تربت سے گوادر گیا ہوں تو دونوں شہروں کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ جیپ جھاڑیوں اور کچے راستے پر چلتی ہوئی دشت سے گزری اب تک گوادر کی بندرگاہ کا کوئی استعمال نہیں ہوا تھا۔ گوادر کا شہر غربت اور افلاس اور پسماندگی کا نمونہ تھا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ہی پہاڑی پر ایک کالونی کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی جس میں جنرلوں، سرکاری عہدیداروں اور بااثر لوگوں کے پلاٹ تھے۔ یہاں سڑکیں بھی بنائی جا چکی تھیں اور مکانات کی تعمیر کے لئے وقت کا انتظار تھا کراچی اور لاہور میں گوادر میں پلاٹوں کی فروخت کے اشتہارات لگے ہوئے تھے۔ اب جبکہ گوادر کی بندرگاہ پر کام شروع ہو چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے بلوچستان کے عام لوگوں کو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔

بلند اقبال

گوادر کی وجہ سے بلوچستان عالمی سیاست میں اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کیونکہ اس سے ہندوستان کو خطرہ ہے کہ اس علاقے میں چین کا تسلط بڑھ جائے گا۔ ایران بھی اس لئے خوش نہیں ہے اور شائد امریکہ کو یہ خیال ہو کہ تجارتی سرگرمیوں سے روس کو فائدہ ہوگا۔ اور مجھے تو یہ بھی نظر آتا ہے کہ سعودی عرب کی جانب سے اس علاقے میں مذہبی انتہا پسندی کو پھیلایا جا رہا ہے۔ ایران اور سعودیہ کی مخالفت شیعہ اور سنی مسلکوں کی وجہ سے ہے۔ اس کے زیر اثر بلوچستان میں ہزارہ قبیلے کے لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اس عالمی صورتحال میں ایران اور سعودی عریبیہ جو تیل کی پیداوار کے مراکز ہیں وہ زیادہ تیل پیدا کر کے عالمی مارکیٹ میں اس کی قیمت کو گرانے پر مجبور ہے۔ تو کیا یہ سب کچھ چین کی گوادر کی آمد اور اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

یہ درست ہے کہ موجودہ حالات میں بلوچستان کی عالمی صورتحال میں اہمیت بڑھ گئی ہے اب جہاں تک مذہبی انتہا پسندی کا سوال ہے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ بلوچستان کے عوام

میں مذہبی انتہا پسندی نہیں ہے۔ ذہنی طور پر یہ لوگ سیکولر ہیں اور مذہب کو سیاسی طور پر استعمال نہیں کرتے ہیں۔ ان کے معاشرے میں مولویوں کا اثر و رسوخ زیادہ نہیں ہے۔ مذہبی انتہا پسندی پشتون قبائل میں ضرور ہے۔ ان کے علاوہ بھی سیاست میں سرگرم ہیں۔ بلوچ نوجوانوں کو تاریخ، فلسفہ، ادب اور سیاست پڑھنے کا سوچ ہے۔ لیکن ان کے اس شوق کو بھی پاکستانی ریاست شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں تربت کے ایک کالج پر ایجنسیوں نے داخل ہوکر اعلان کیا کہ انہوں نے وہاں سے تخریبی لٹریچر برآمد کیا ہے یہ تخریبی لٹریچر کیا تھا۔ نہرو اور گاندھی کی آب بیتیاں اور میری بھی ایک کتاب غلامی اور نسل پرستی شامل تھی، ان کتابوں کو ٹی وی پر بھی بتایا گیا اور فخر کیا گیا کہ انہوں نے نوجوانوں کو تخریبی کتابوں سے بچا لیا۔ اب اگر ریاست کا یہ رویہ رہا تو اس صورت خوشگوار تعلقات کی اُمید کم ہی کرنی چاہیے۔ بلوچستان اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہے اس میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہاں میں ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ جب میں ایک بار تربت گیا اور وہاں نوجوانوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی جدوجہد اسی وقت کامیاب ہوگی جب وہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کریں گے اور ان میں سیاسی شعور پیدا کریں گے۔ تو اس پر ایک نوجوان نے کہا کہ دوسرے صوبوں کے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کریں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بلوچستان کے لوگوں کا ساتھ دینا چاہیے اور انہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے جیسا کہ ہم نے بنگلہ دیش کے لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔

بلند اقبال

آپ بلوچستان میں سعودی عرب اور ایران میں سیاسی اور فرقہ وارانہ تصادم کے حوالے سے کیا دیکھتے ہیں کیونکہ بلوچ، بلوچستان ایران اور افغانستان میں آباد ہیں وہ سنی عقیدے کے لوگ ہیں۔ کیا بلوچستان میں سعودیہ عرب اپنا اثر بڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

بلوچستان میں ہزارہ کے علاوہ اکثریت کا تعلق سنی مسلک سے ہے لیکن ان کے معاشرے میں شیعہ سنی فرقہ وارانہ جذبات نہیں ہیں۔ ہزارہ قبیلے کے لوگوں کا جو قتل عام ہوا ہے اس میں بلوچستان کے باہر کی دہشت گرد مذہبی جماعتیں ہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف ہزارہ کے لوگوں کو قتل کیا بلکہ وہ پاکستانی زائرین جو ایران جاتے ہیں، اُنہیں بسوں سے اُتار کر ان کے شناختی کارڈ دیکھ کر اور جسم پر ماتم کے نشان دیکھ کر گولیوں کا نشانہ بنایا۔ لیکن بلوچستان میں ان واقعات کے باوجود کوئی فرقہ وارانہ واقعات نہیں ہوئے۔

آپ نے سعودی عرب کے حوالے سے جو بات کی ہے تو اُنہوں نے سندھ اور جنوبی پنجاب میں وہابی عقیدے کو پھیلانے میں بڑی رقم خرچ کی ہے لیکن بلوچستان میں ہمیں ان کی موجودگی نظر نہیں آتی ہے۔ آپ کا یہ سوال کہ کیا آزاد بلوچستان کا قیام ممکن ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ریاست کی پالیسیوں سے تنگ آ کر جذباتی طور پر بلوچ نوجوان آزادی کی بات کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ پاکستان میں رہنے کے لئے پاکستانی ریاست کو چاہیے کہ ان کو پورے پورے حقوق دے اور پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں کو چاہیے کہ ان کی اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔ پاکستانی ریاست کو یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ تشدد سے لوگوں کو ریاست کا وفادار نہیں بنایا جاسکتا۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاست میں بلوچوں کی بھرپور شرکت ہوتا کہ وہ خود کو ریاست سمجھیں اسے اپنا دشمن نہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے گا کہ آزاد بلوچستان ہندوستان اور ایران کے لئے فائدہ مند ہوسکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

نہیں ایران کے لئے بالکل فائدہ مند نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں ایران کے اندر بلوچی بھی آزادی کی بات کریں گے اس کے علاوہ بکھرے ہوئے افغانوں کو جو افغانستان بالائے سندھ اور جنوبی پنجاب میں آباد ہیں انہیں متحد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی ایک سوال ہے کہ کیا پشتون جن کا تعلق افغانستان اور پختونخواہ سے ہے وہ آزاد بلوچستان کو قبول کریں گے۔ آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ بلوچستان سے میرا تعلق یہ ہے کہ میرے آباؤ اجداد مغلوں کے زمانے میں پشین سے ہندوستان گئے تھے۔ اور دوسرا تعلق یہ ہے کہ میری سب سے زیادہ کتابیں پڑھنے والے بلوچ نوجوان ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے۔

بلند اقبال

ہم بھی آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے بلوچستان کی صورت حال پر ہم سے اپنے خیالات شیئر کئے۔

☆.....☆.....☆

4- خیبر پختونخواہ

بلند اقبال

آج ہم پختونخواہ کے بارے میں بات کریں گے کیونکہ پختونخواہ وہ علاقہ ہے جو اپنی سیاسی صورتحال کی وجہ سے کافی توجہ طلب رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی اس صوبے کی سیاست نے ملک کے حالات پر اثر ڈالا ہے۔ خان عبدالغفار خان جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے کس طرح ملک کی سیاست کو متاثر کیا اس کا بھی ہم ذکر کریں گے ۔ اور سندھ کی جی ایم سید کی شخصیت کے حوالے سے بھی ان کا ذکر کریں گے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے اور میرے ساتھ اس موضوع پر بات کرنے کے لئے پروفیسر مبارک علی ہیں۔ تو پروفیسر صاحب آپ کے آنے کا شکریہ۔ اُمید ہے آپ اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

خیبر پختونخواہ کی سرزمین تاریخی اعتبار سے بہت قدیم ہے۔ جیسے جیسے آثار قدیمہ کے ذریعے شواہد سامنے آ رہے ہیں اسی طرح سے اس کی تاریخی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے پٹھان بھی اپنی تاریخ کے بارے میں دو رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً کچھ کا یہ خیال ہے کہ پٹھان یہودیوں کے گمشدہ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رائے کو مغلوں کے دور میں لکھی جانے والی کتاب جو نیامت اللہ ہروی جو مخزن افغانی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں

پٹھانوں کو یہودی النسل بتایا گیا ہے۔لیکن اب مزید تحقیق ہوئی ہے جو افغانوں کو آریائی نسل ثابت کرتے ہیں۔ یہ ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں آئے اس کے علاوہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔مثلاً جب یہاں پر وسطِ ایشا سے کسشان آئے تو انہوں نے پختونخواہ کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کی۔اس خاندان کا مشہور حکمران کنشک تھا جس نے پشاور شہر کو بسایا جب اس نے بدھ مذہب اختیار کیا تو اس کی تبلیغ کے لئے بھی کوششیں کیں۔اس کی سرپرستی میں یہاں کئی کانفرنسیں ہوئیں جن میں بدھ مذہب کے بڑے بڑے عالموں نے شرکت کی اور بدھ مذہب پر بحث ومباحثے کئے۔اس کے نتیجے میں بدھ مذہب دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا یعنی مایایان (بڑے پہیے والا) اور ہن یا (چھوٹے پہیے والا) اس کے علاوہ یہاں پر ہی یہ فیصلہ ہوا کہ گوتم بدھ کے مجسمے بنائیں جائیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مجسمے اس تمام علاقے میں پھیل گئے ہیں جن میں سب سے بڑا مجسمہ بامیان کا تھا۔ جسے طالبان نے مسمار کر دیا۔اس کے علاوہ سوات کی پہاڑیوں میں بھی گوتم بدھ کے مجسمے ملتے ہیں۔ بلکہ مذہبی اقوال کو چٹانوں پر لکھا گیا ہے۔ان تحریروں کو اب جرمن ماہرین نے محنت سے اکٹھا کر کے شائع کر دیا ہے۔

سوات کی پہاڑیوں پر کئی ایسی غار ملے ہیں جہاں بدھ مذہب کے بھکشو عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔لہٰذا بدھ مذہب کی وجہ سے اس علاقے کی تہذیب خاص انداز میں تشکیل ہوئی جس کی وجہ سے ان کے تعلقات افغانستان، وسط ایشیا اور ایران سے رہے۔ایران کے خمینی خاندان کے دوران یہاں ایرانی حملہ آور آئے اور اس پر حکومت کی یہ حملہ آور اپنے ساتھ زرتشت کے مذہب کو بھی لے کر آئے۔ان عقائد نے بھی یہاں کے لوگوں کی زندگی پر اثر ڈالا۔اسکندر یونانی نے بھی اسی علاقے سے گزر کر ہندوستان پر حملے کئے تھے اس کے واپس جانے کے بعد یہاں یونانیوں کی کئی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں۔اس یونانی کلچر کے اثرات کو گندھارا کے کلچر میں دیکھتے ہیں۔مثلاً اس عہد میں گوتم بدھ کے جو مجسمے بنائے گئے وہ یونانی طرز کے تھے یہ نمونے ہم لاہور میوزیم کی گندھارا گیلری میں دیکھ سکتے ہیں۔اسکندر کے جانے کے

بعد ہندوستان میں موریہ سلطنت قائم ہوئی۔ تو یہ علاقہ اس کا ایک حصہ تھا۔ اشوک نے بدھ مذہب کی تبلیغ کے لئے جو کتبات نصب کرائے وہ قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کتبات میں اس نے ہر مذہب کے احترام اور امن وآشتی پر زور دیا ہے

یہاں پر میں ٹیکسلا میں قائم ہونے والی یونیورسٹی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اگرچہ ہمیں اس کے بارے میں پوری معلومات تو نہیں ملتی لیکن ہم یہ اندازہ ضرور کر لیتے ہیں کہ اس یونیورسٹی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ چین وسطِ ایشیا، ایران اور افغانستان سے طالب علم آتے ہوں گے۔ پانینی (PANINI) جو گرامر کے علم کا ماہر تھا وہ اس یونیورسٹی کا استاد تھا۔ کوٹلیہ جس نے ارتھ شاستر نامی مشہور کتاب لکھی اس نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔

بلند اقبال

خیبر پختونخواہ کا یہ علاقہ ایک جانب افغانستان سے ملتا ہے اور دوسری جانب پنجاب سے کیا وجہ ہے کہ اس پر پنجاب سے زیادہ افغانی اثرات ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخی طور پر خیبر پختونخواہ کا تعلق افغانستان سے اس وجہ سے اہم رہا کیونکہ تمام حملہ آور بولان یا خیبر کے راستے حملہ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی آبادی بھی ان کے ساتھ مل کر چڑھائی کر دیتے تھے۔ بابر بھی خیبر کے راستے اس علاقے میں آیا اور یہاں اس نے یوسف زئی قبیلے کی خاتون مبارک سے شادی کر لی جس کی وجہ سے مغلوں کا تعلق اور رشتہ اس قبیلے سے ہوگیا۔ مغلیہ عہد میں یہ علاقہ اس وجہ سے بھی اہم تھا کیونکہ سرکار کابل مغل سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ اور مغل فوجیں اور اس کے منصب دار اس علاقے سے گزر کر کابل جاتے تھے۔ جب اکبر کے بھائی مرزا ابراہیم نے بغاوت کی تو اکبر معہ اپنے لاؤلشکر کے اس علاقے سے گزر کر کابل گیا اور مرزا حکیم کو کو شکست دے کر حالات پر قابو پایا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس علاقے کے قبائل نے مغلوں کی پوری طرح سے اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر نے خود یہاں

آ کر ان کے خلاف جنگیں لڑیں اور جب وہ بیربل کے ذمہ یہ کام سپرد کر کے واپس چلا گیا تو بیربل قبائلیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا جس کا اکبر کو بہت افسوس ہوا۔ اکبر ہی کے زمانے میں یہاں ایک مذہبی تحریک ابھری جو روشنیاء کے نام سے مشہور ہوئی اس کے بانی بایزید انصاری تھے، کہا جاتا ہے کہ پشتو میں نثر میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس تحریک کے گرد کئی پٹھان قبائل جمع ہوگئے۔ بایزید نے اپنی تعلیمات میں قافلوں کو لوٹنا اور جنگوں میں مال غنیمت حاصل کرنا جائز قرار دے دیا تھا۔ مغل مورخ اس تحریک کو روشنائی کی بجائے تاریکی کا نام دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے عہد میں بھی یہ علاقہ پوری طرح سے اُن کے تسلط میں نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں خوشحال خان خٹک نے اپنی شاعری کے ذریعے قبائل کو مغلوں کے خلاف بھڑکایا۔ ویسے بھی مغلوں اور افغانوں میں ابتداء ہی سے چپقلش تھی۔ کیونکہ شیر شاہ نے مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکالا تھا اس لئے وہ ان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

بلند اقبال

مغلوں کے زوال کے بعد یہ علاقہ افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں کی گزرگاہ بنا اور یوں اسے تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ذرا یہ بتائیں کہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے بعد اس علاقے پر کیا اثرات ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک علی

جب خاندانِ مغلیہ کمزور ہوا اور اس میں اپنے دفاع کی طاقت اور قوت نہیں رہی تو افغانستان سے حملہ آوروں کی آمد شروع ہوئی۔ مثلاً ان حملہ آوروں میں نادر شاہ مشہور ہے جو صدیوں کے جمع شدہ مغل خزانے لوٹ کر لے گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے جو ہر سال آتا اور ہندوستان میں لوٹ مار کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اس روایت کو جاری رکھا مگر اس دوران ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ رنجیت سنگھ نے افعان حملہ آوروں کو روکنے کے سخت

اقدامات کئے ۔اس مقصد کے لئے اس نے طورخم تک کے علاقے کو سکھ سلطنت میں شامل کر کے دفاعی انتظامات کئے اور حملوں کا خاتمہ کر دیا۔

سکھ دورِ حکومت کا ایک اہم واقعہ سید احمد شہید کی تحریک محمدی یا جہاد تحریک ہے۔شمالی ہندوستان سے مجاہدین اس مقصد کے لئے پختونخواہ میں آئے تا کہ سکھوں سے جنگ کر کے پنجاب اور پختونخواہ کو آزاد کرایا جائے۔لیکن چونکہ ان کی آمد اچانک تھی اور پٹھان ان کے مذہبی عقائد اور سیاسی عزائم سے ناواقف تھے۔اس لئے سید احمد شہید کی جنگیں پٹھان قبیلوں سے ہوئیں جس کی وجہ سے وہ یہاں اپنا مکمل اقتدار قائم نہیں کر سکے۔1983ء میں بالاکوٹ کے مقام پر ان کو سکھوں کے ہاتھوں شکست ہوئی جس نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

بلند اقبال

ذرا یہ بتائیں کہ انگریزوں نے اس علاقے کا انتظام کس طرح سنبھالا؟

ڈاکٹر مبارک علی

جب ہم پختونخواہ کی جغرافیائی حیثیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔اس کی آبادیاں قبائلی نظام میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہر قبیلے کے اپنے رسم و روایات ہیں۔زندگی سادہ اور سخت حالات سے گزرتی ہے۔قبائلی جھگڑوں کی وجہ سے ہر شخص مسلح رہتا ہے قبیلے کے سردار کی بڑی اہمیت ہے۔ جو اپنے قبیلے کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے۔اس لئے جب انگریز یہاں پر آئے تو انہوں نے اس علاقے کی نوعیت کو بھی دیکھا قبائل کی ذہنیت کو بھی سمجھا اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے طریقوں کو بھی دریافت کیا۔انتظامی طور پر انہوں نے ایک کام یہ کیا کہ قبائل کو کنٹرول کرنے کے لیے اس کو مختلف ایجنسیوں میں تقسیم کر دیا جیسے کرم ایجنسی، مہمند ایجنسی اور خیبر ایجنسی وغیرہ پھر ہر ایجنسی میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا اور اس کو اختیارات بھی سونپے گئے۔اس کا کام یہ تھا کہ قبائل کے خوانین سے مل کر امن و امان برقرار رکھے۔خوانین کی وفاداری خریدنے کے لئے ان کے وظائف مقرر کئے تھے۔اور حکومت

کی جانب سے انہیں کافی مراعات دی جاتی تھیں۔لیکن اگر کہیں بغاوت ہوتی تو اسے سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔قبائل کو ایجنسی کے ذریعے قابو میں لانے کے بعد فاٹا یا قبائلی علاقہ علیحدہ سے بنایا گیا جہاں برطانوی ریاست اور قانون کا کوئی نفاذ نہ تھا۔ بلکہ یہ علاقہ غیر کہلاتا تھا اور جو بھی یہاں پناہ لیتا تھا وہ قانون کی نظر میں آزاد تھا۔

پاکستان بننے کے بعد بھی کولونیل دور کا یہ انتظامی ڈھانچہ اسی طرح سے برقرار رہا جس کی وجہ سے پٹھان قبائل خود کو ریاست کی بندشوں سے آزاد سمجھتے ہیں۔ چونکہ اسے مکمل طور پر پاکستان کی ریاست میں شامل نہیں کیا گیا اس وجہ سے قبائلی علاقوں میں تعلیم صحت اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہیں کیا گیا۔

بلند اقبال

اس سے پہلے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد پختونخواہ کے بارے میں بات کریں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں پر ہم خان غفار خان جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے اور انہوں نے انگریزی حکومت کے دوران جو سیاست کی اس بارے میں آپ ہمیں بتائیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

غفار خان کے سیاسی کردار کو سمجھنے کے لئے پٹھانوں کے قبائلی معاشرے کو سمجھنا ضروری ہے۔ایک تو ان میں تعلیم کی کمی تھی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل نہیں تھی دوسرے قبائل کے آپس میں جھگڑے اور تنازعات ہوتے رہتے تھے اس لئے ہر پٹھان مسلح ہوتا تھا اور جنگ کے لئے تیار لہٰذا تعلیم کی کمی اور شدت پسندی یہ روایت پٹھانوں میں رچ بس گئیں تھیں۔انتقام لینا باعثِ عزت تھا۔ اس ماحول میں جب خان غفار خان نے اپنی تحریک خدائی خدمت گار شروع کی تو اس کا مقصد یہی تھا کہ پٹھانوں میں تعلیم کو عام کیا جائے اور اُن کی شدت پسندی کو امن میں تبدیل کر دیا جائے۔ برطانوی حکومت نے اس تحریک کی کامیابی کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ان کا خیال تھا کہ اگر پٹھان تعلیم یافتہ ہو گئے تو ان میں سیاسی شعور آئے گا اور یہ متحد ہو کر

حکومت کے خلاف ہو جائیں گے۔ جب کہ خان غفار خان حکومت سے کسی بھی قسم کی مسلح جنگ نہیں چاہتے تھے وہ امن کے ذریعے لوگوں کو آپس میں ملانا چاہتے تھے۔لیکن انگریزی حکومت نے خدائی خدمت گار کی تحریک کو اپنے خلاف ایک سازش سمجھا اور پورے برطانوی دور میں خان غفار خان نے پندرہ سال جیل میں کاٹے انہیں تین تین سال کے لئے جیل بھیج دیا جاتا تھا۔کبھی وہ ڈی جی خان کی جیل میں، کبھی میانوالی کی جیل اور کبھی ہندوستان کی دوسری جیلوں میں۔جیل کی زندگی انتہائی سخت ہوتی تھی یہاں گرمی اور سردی کی شدت کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

قیدیوں سے محنت ومشقت کرائی جاتی تھی، صفائی اور ستھرائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا جس کی وجہ سے بیماریاں آ لیتی تھیں۔غفار خان نے ان تمام سختیوں کو برداشت کیا اور نہ تو کبھی اپنی سزا کے خلاف اپیل کی اور نہ ہی حکومت سے کچھ طلب کیا۔ ہر بار اپنی سزا پوری کر کے آئے اور آتے ہی تحریک کے کاموں میں مصروف ہو گئے، ان کے اس کردار سے اُن کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

بلند اقبال

قصہ خوانی بازار میں جو قتلِ عام ہوا اسے آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

قصہ خوانی بازار کا قتل عام خدائی خدمت گار تحریک کا بڑا امتحان تھا۔ کیونکہ قصہ خوانی بازار کے اس جلسہ عام میں حکومت کی جانب سے دہشت گردی کا مظاہرہ کیا گیا اور گولی چلا کر لوگوں کا قتلِ عام کیا گیا جب کہ پٹھانوں کی جانب سے دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے نہیں دیا گیا۔لہٰذا اس واقعہ نے خان غفار خان کی اُس تعلیم کو جو انہوں نے امن کے لئے دی تھی درست ثابت کر دیا۔انہوں نے نہ صرف پٹھانوں کی ذہنیت بدلی بلکہ انہیں فرسودہ روایات سے بھی آزاد کر دیا۔ یہ ایک بڑا پرامن انقلاب تھا جس نے پٹھان معاشرے کو پُرامن کر کے رکھ

دیا تھا۔

بلند اقبال

خان غفار خان کی شخصیت ہندوستان کی تقسیم کے وقت متنازعہ ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے بارے میں یہ عام تصور دیا گیا کہ وہ گاندھی جی اور ان کے فلسفے کے حامی تھے اور کانگریس کی سیاست پر یقین رکھتے ہوئے صوبے میں اس کا اقتدار چاہتے تھے۔ جب کانگرس نے تقسیم کے وقت پختونخواہ میں ریفرنڈم کے اصول کو تسلیم کیا تو غفار خان نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور کانگرس کے اس فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہمیں خونخوار درندوں کے سامنے پھینک رہے ہیں۔ کیا ایسا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سب سے پہلے تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب خان عبدالغفار خان نے عدم تشدد کی پالیسی کا پرچار شروع کیا تو ان کا گاندھی جی سے کوئی واسطہ نہ تھا، یہ ان کا اپنا آزادانہ فیصلہ تھا۔ کیونکہ وہ تشدد کو پٹھان قبیلوں کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی سیاست اور کانگرس سے ان کے روابط بعد میں ہوئے کیونکہ ایک مرحلے پر آ کر وہ اس کے قائل ہوئے کہ خدائی خدمتگار کی تحریک اکیلے رہ کر انگریزی حکومت کے خلاف کامیابی حاصل نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُسے ہندوستان کی سیاست سے جوڑ کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس لئے غفار خان نے پہلے مسلم لیگ کی لیڈرشپ سے رابطے کئے کہ وہ ان کی مدد کریں۔ مگر مسلم لیگ نے ان کے ساتھ تعاون کرنے میں دلچسپی نہیں لی۔ اس لئے بعد میں انہوں نے کانگرس کے لیڈروں سے بات چیت کی تو وہ ان کی مدد کے لئے تیار ہوگئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی خدمتگاروں کی حمایت صرف ایک علاقے تک محدود نہیں رہی بلکہ کانگرس اور اس کے لیڈر گاندھی جی اور نہرو کے ساتھ مل کر خان غفار خان کی شخصیت علاقائی سے کل ہندوستانی ہوگئی۔

چونکہ ان کے اور گاندھی جی کے عدم تشدد میں ہم آہنگی تھی اس لئے عرف عام میں

انہیں سرحدی گاندھی کہا جانے لگا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انہوں نے اپنی تحریک کی آزادی کو برقرار رکھا اور کانگرس نے جب بھی مالی تعاون کی پیش کش کی تو اسے قبول نہیں کیا۔

وہ کانگرس سے اس وقت نا اُمید ہوئے جب تقسیم کے وقت کانگرس نے مسلم لیگ کے اس فیصلے کو مان لیا کہ صوبے میں مجلس قانون ساز کی بجائے ریفرنڈم کے ذریعے لوگوں سے رائے لی جائے۔ دوسرے صوبوں میں یہ حق صوبوں کی مجلسِ قانون ساز کا تھا کہ وہ تقسیم کے حق میں یا مخالفت میں فیصلہ کریں پختونخواہ کی اسمبلی میں چونکہ خدائی خدمت گاروں کی اکثریت تھی اور صوبے کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب تھے اس لئے مسلم لیگ کو اندازہ تھا کہ اگر فیصلہ اسمبلی کے ایوان میں کرایا جائے گا تو اکثریت پاکستان کی حمایت پیش کرے گی۔ اس لئے ریفرنڈم کے طریقہ کار کو منتخب کیا گیا، خان غفار خان نے اس کا بائیکاٹ کیا اور اکثریت نے پاکستان کی حمایت کی۔

پاکستان کے بننے کے بعد پختونخواہ کی وہ واحد اسمبلی تھی جو تقسیم کے خلاف تھی۔ اس لیے جب قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل بنے تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ کوئی ربڑ سٹمپ گورنر جنرل نہیں ہوں گے۔ اس لئے 1935ء کے دستور میں ترامیم کے ذریعے انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی صوبے کی اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کو معزول کیا اور اسمبلی میں ان کی اکثریت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

بلند اقبال

میں یہاں پر یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ خان غفار خان اور جی ایم سید کی شخصیات میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ خان غفار خان تو تقسیم کے خلاف ہی رہے لیکن جی ایم سیّد نے ابتداء میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور پاکستان بنانے میں حصہ لیا۔ مگر بعد میں انہوں نے نہ صرف مسلم لیگ کی مخالفت کی بلکہ سیاست میں اپنا جدا راستہ بنایا۔

ڈاکٹر مبارک علی

خان غفار خان کا المیہ یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد انہیں شروع ہی سے ملک کا مخالف قرار دے کر ان پر الزامات لگائے گئے ان کو ہندوستان کا ایجنٹ قرار دے کر ان کے سیاسی کردار کو مسخ کیا گیا اور تقسیم سے پہلے انہوں نے پختونخواہ میں جو سیاسی سماجی اور فلاحی کام کئے تھے۔ اُن کو تاریخ سے نکال دیا گیا اور پاکستان کی تاریخ میں ان کو شامل نہیں کیا گیا۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ خان غفار خان نے پاکستان بننے کے بعد بھی زندگی کا بڑا حصہ پاکستان کی جیلوں میں گزارا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ انہیں انگریزی حکومت نے بھی اپنا مخالف سمجھا اور پاکستانی حکومت نے بھی لیکن پختونخواہ عوام میں ان کی عزت واحترام آخر تک قائم رہا اور ان کی خواہش کے مطابق مرنے کے بعد انہیں جلال آباد میں دفن کیا گیا۔ اس موقع پر افغانستان میں جنگ ہو رہی تھی مگر جب ان کا جنازہ جلال آباد لے جایا گیا تو اس موقع پر جنگ بندی کا اعلان ہوا، تا کہ امن کے اس حامی کو جنگی ماحول سے نہ گزارا جائے۔ میرا خیال ہے کہ پختونخواہ عوام کی گہری عقیدت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

جہاں تک جی ایم سید کا ذکر ہے تو انہوں نے مسلم لیگ سے جدا ہو کر سیاست میں سندھ کے حقوق کی بات کی اور ملک میں جمہوری اور سیکولر نظام حکومت لانے والی سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیا لیکن عمر کے آخری حصے میں ضیاء الحق سے ملاقات کر کے جو ایک آمر اور غاصب تھا انہوں نے اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا۔

بلند اقبال

انگریزوں کے زمانے میں صوبہ کو فرنٹیئر یا سرحد کا نام دیا گیا۔ جو برطانوی نقطہ نظر سے تو ٹھیک تھا لیکن پاکستان بنے کے بعد جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسے پختونخواہ کا نام دیا جائے تو خصوصیت کے ساتھ پنجاب میں مخالفت ہوئی اور آخر میں اس پر سمجھوتہ ہوا کہ اسے خیبر پختونخواہ کا نام دیا جائے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی

پختونخواہ کے نام سے خاص طور پر پنجاب کے سیاسی رہنماؤں کو یہ ڈر لگتا تھا کہ آگے چل کر کہیں یہ افغانستان سے مل کر ایک نیا ملک نہ بن جائے اس لئے خیبر کا اضافہ کر کے لفظی طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ اسلام کی وجہ سے پختونستان نہیں بنے گا۔ لیکن یہ سب کچھ کم فہمی اور صحیح صورتحال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اس وقت پشتون پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر پشتونستان ہوتا تو یہ اس میں محدود ہو کر رہ جاتے۔ اب ان کے لئے بلوچستان سندھ اور پنجاب کیسے ہوئے ہیں۔ چونکہ پشتون محنتی قوم ہے۔ سڑکیں بنانے، عمارتوں کی تعمیر اور کارخانوں میں مزدوروں سے لے کر تجارت تک میں چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ لاہور کے اندرونی شہر میں تقریباً تمام تجارت پر پشتونوں کا قبضہ ہے اور اب وہاں پنجابی کی جگہ پشتو بولی جاتی ہے۔ کراچی شہر میں پشتونوں کی ایک بڑی آبادی ہے جو ٹرانسپورٹ پر مکمل قابض ہے۔ فروٹ اور سبزی منڈیاں ان کے تسلط میں ہیں اب اس کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے تجارتی مراکز میں ان کی دکانیں ہیں۔ اس لئے پشتون طبقے نے اس صورت حال سے بہت فائدہ اٹھایا ہے نوکر شاہی اور فوج میں بھی پشتونوں نے اپنا حصہ لے لیا ہے۔ لہٰذا پختونستان کا نظریہ اپنے آپ ہی ختم ہو گیا اس لئے نام میں اضافہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ پشتون اپنی زبان اپنی تاریخ اور اپنے کلچر سے ایک شناخت رکھتا ہے۔ اس کی اس شناخت کو ختم کرنے کی بجائے اسے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

بلند اقبال

سوال یہ ہے کہ کیا پختونستان علیحدہ رہ کر قائم رہ سکتا تھا اور اب جو بھی صورت حال ہے کہ جس میں صوبے میں پی ٹی آئی کی حکومت ہے تو اس نے صوبے کے حالات پر اثر ڈالا؟

ڈاکٹر مبارک علی

اگر بغور دیکھیں تو پختونستان کا نعرہ جب وہ ایک خاص سیاسی حالات میں تھا جب کہ خان عبدالغفار خان کو حکومتِ پاکستان نے نظر انداز کر دیا تھا اس لئے انہوں نے پشتونستان کی بات کی جو آزاد ہو کر پشتونوں کے عزائم کو پورا کرے گا۔ مگر پختونستان کا بحیثیت ایک آزاد ملک کے قائم رہنا ناممکن تھا کیونکہ افغانستان سے جو ان کا رشتہ بنتا ہے اس میں ان کے لیے کوئی فائدے نہیں تھے۔ کیونکہ خود افعانستان اپنی روزمرہ زندگی کے لئے بھی اپنے ہمسایوں کا محتاج ہے۔ اس کے علاوہ پختونخواہ میں نہ تو کوئی صنعت ہے نہ کوئی زرعی پیداوار کہ آبادی کی ضروریات پوری کر سکے، نہ ہی معدنیات کی کانیں اور نہ ہی تعلیم و تربیت اور انتظامی امور کے ماہرین جو ملک کو چلا سکیں، اس لئے اگر وہ پاکستان سے علیحدہ ہوتا تو اس کے لئے اپنی آزادی کو برقرار رکھنا مشکل تھا جس طرح ہندوستان میں سکھوں کی خالصتان کی تحریک ناکام ہوئی۔ کیونکہ سکھوں کی اکثریت نہیں چاہتی تھی کہ وہ خالصتان میں محدود ہو کر خود کو قید کر لیں۔ انہیں اپنی سرگرمیوں کے لئے پورا ہندوستان ملا ہوا تھا۔ یہی صورتحال پشتونوں کی تھی اس لئے پشتونستان کا نعرہ اپنے آپ ہی ختم ہو گیا۔

اب آپ نے جو سوال کیا ہے کہ پختونخواہ میں پی ٹی آئی حکومت نے کیا تبدیلیاں کیں۔ یقیناً کچھ اصلاحات تو ضرور ہوئی ہیں لیکن یہ صوبہ کوئی ماڈل نہیں بن سکا کہ جس سے دوسرے صوبے سبق سیکھیں، کیونکہ جب تک صوبے میں لوگوں کو روزگار نہیں ملے گا اور ان کی معاشی حالت بہتر نہیں ہوگی تو اس وقت تک بے چینی اور کنفیوژن قائم رہے گی۔

بلند اقبال

اس پروگرام میں ہم نے کوشش کی ہے کہ پاکستان میں دوسرے صوبوں کی طرح صوبہ پختونخواہ کی تاریخ، کلچر اور سیاست پر روشنی ڈالی جائے ہمارے یہ پروگرام علمی نوعیت کے

ہوتے ہیں اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ذریعے لوگوں میں حالات کو سمجھنے کا فہم اور شعور دیا جائے اور یہ شوق بھی پیدا ہو کہ مزید ان موضوعات پر معلومات حاصل کرنے کے لئے مزید مطالعہ کریں۔

آپ کا ڈاکٹر صاحب

بہت بہت شکریہ۔

☆.....☆.....☆

5-یونانی فلسفہ

بلند اقبال

ناظرین! علمی دنیا میں فلسفے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ سبق اور فکر کو پیدا کرتا ہے۔ چاہے ہم سائنس کا مطالعہ کریں یا سماجی علوم کا ان سب کی تہ میں ہمیں فلسفیانہ افکار اور خیالات ملتے ہیں۔ فلسفے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مغربی فلسفہ اور مشرقی فلسفہ، مغربی فلسفہ کی بنیاد یونانی فلسفے پر ہے اور مشرقی فلسفے میں ہندوستان کا نام آتا ہے۔

ہمیں ان دونوں فلسفوں میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ مغربی فلسفے میں دلیل عقل پر زور دیا گیا ہے جبکہ مشرقی فلسفے میں جذبات اور احساسات کا دخل ہے۔

فلسفے پر بحث کرتے ہوئے ہم یونانی ہندوستانی اور اسلامی فلسفے پر بات کریں گے۔ اس پروگرام میں میری مدد کے لئے پروفیسر ڈاکٹر مبارک صاحب شریک ہیں۔

بلند اقبال

پروفیسر صاحب آپ یہ بتائیں کیا ہم یونانی فلسفے کا آغاز سقراط سے پہلے کے فلسفے سے کریں یا سقراط سے؟

ڈاکٹر مبارک علی

یونانی فلسفے پر بات کرتے ہوئے ایک حیران کن چیز یہ نظر آتی ہے کہ ایک چھوٹا سا

ملک جس نے ایک خاص مدت کے اندر اتنے بڑے بڑے سائنسدان اور فلسفی پیدا کیے جن کی بنیاد پر سائنس اور دوسرے علوم ترقی پاتے رہے۔ یونانی فلسفے کی ابتدا Ionia (آیئونیا) کے جزیرے میں ہوئی۔ یہ یونانی کالونی تھا اور مغربی ترکی میں واقع ہے۔ ایک تجارتی کالونی ہونے کی وجہ سے یہ تجارت کا مرکز تھا۔ جہاں مشرقی اور مغربی ممالک کے تاجر آتے تھے جس کی وجہ سے Ionia کی حیثیت نہ صرف تجارتی ہوگئی تھی بلکہ علمی لحاظ سے بھی اس نے ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں یہاں پر جو فلسفی پیدا ہوئے، انہوں نے اس کائنات کے بارے میں جو خیالات دیے ہوا نہائی اہم ہیں۔ سب سے پہلا فلسفی جس کا نام تاریخ میں آتا ہے وہ تھیلز (Thales) ہے۔ اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دانشمند اور عقلمند بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے مصر کا دورہ بھی کیا تھا اور اسی نے اہرامِ مصر کے سائے سے ان کی بلندی ناپنے کا خیال پیش کیا تھا۔ اسی نے چاند گرہن ہونے کی بھی پیشین گوئی کی تھی۔ تجارت میں بھی اس کا ذہن چلتا تھا۔ اس نے زیتون کے درختوں کی کاشت کر کے کافی پیسہ جمع کیا تھا۔ سائنس میں اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ یہ دنیا پانی سے بنی ہے۔ اس کے بعد اس کے شاگرد Anaximenas اور Anaximander نے دنیا کی تخلیق کے تین عناصر اور بتائے یعنی ہوا، آگ اور مٹی اس کے بعد ہم Ionia میں ایک اور فلسفی کو دیکھتے ہیں جس کا نام Heraclitus تھا۔ یہ وہی ہے جس نے یہ مشہور جملہ کہا تھا کہ کوئی شخص ایک ہی دریا میں دوبارہ پیر نہیں رکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز متحرک ہے اور مستقل اپنی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک اور فلسفی Parmenides ہے جس نے Monism کا فلسفہ پیش کیا یعنی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، تبدیل نہیں ہوتی۔ Pluralism اور Monism، یہ دو ایسے افکار ہیں کہ جو آج بھی فلسفیانہ بحث و مباحثہ کا مرکز ہیں اور جن کا اطلاق سیاست میں بھی ہوتا ہے۔

ایک تیسرا فلسفی Democritus تھا جس نے ایٹم کا تصور پیش کیا تھا لیکن اس کے افکار کو آنے والے دور میں ختم کر دیا گیا۔ اس لیے اس کے بارے میں بہت کم معلومات

دستیاب ہیں۔

آئیونیا (Ionia) سے دور یونان کی ایک اور کالونی سسلی (Sicily) میں فیثاغورث (Phthagoras) نے ریاضی کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ یہ آواگون کا قائل تھا اور یقین رکھتا تھا کہ آسمان پر ستاروں کے درمیان ایک ایسی روحانی موسیقی پیدا ہوتی ہے جسے ریاضیت کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس دور کے ان فلسفیوں نے سائنس کے بارے میں اپنے مشاہدے پیش کیے۔ ان کی بنیاد کسی تجربے پر نہیں تھی لیکن انہوں نے جس گہرائی سے فطرت کو دیکھا کائنات کو سمجھا اور اس کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے وہ آنے والے دور میں سائنس کی بنیاد بنے۔

چوتھی صدی عیسوی میں فلسفہ آئیونیا سے نکل کر ایتھنز (Athens) کے شہر میں چلا جاتا ہے۔ ایتھنز کا شہر اس وقت یونان کا سیاسی اور ثقافتی مرکز تھا۔ یہاں پر ہمیں سقراط کی شخصیت ملتی ہے جس نے فلسفے کو ایک نئی شکل دی۔ کیونکہ آئیونیا کے فلسفیوں نے نیچر کے بارے میں اپنے خیالات کی تشکیل کی تھی لیکن سقراط نے نیچر اور کائنات سے علیحدہ ہو کر انسانی معاملات پر توجہ دی۔ یہ ایک بڑی اہم تبدیلی تھی۔ انسانی ذہن انسانی سماجی اور اس کی بنیادوں کو سمجھنا چاہیے اور پھر اس کی تشکیل ان اخلاقی اصولوں پر ہونا چاہیے جو سماج کو مسرت اور خوشی سے سرشار کریں۔ سقراط کا طریقہ کار بھی بہت مختلف تھا۔ وہ وعظ اور نصیحت کی بجائے لوگوں سے سوال کرتا تھا اور اسی میں سوال کا جواب، ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً اس کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن اس نے راستے میں ایک نوجوان سے پوچھا کہ

نوجوان! تم بتاؤ گے روٹی کہاں سے ملتی ہے، نوجوان نے جواب دیا: ''گلی کے کونے پر جو دکان ہے وہاں مل جائے گی'' اس نے دوسرا سوال کیا اور شراب کہاں سے ملے گی؟'' اس نے کہا: اس کے قریب ہی دکان ہے جہاں سے شراب بھی مل جائے گی۔'' سقراط نے تیسرا سوال کیا: ''نوجوان! یہ تو بتاؤ نیکی کہاں سے ملے گی؟'' اس سوال پر نوجوان پریشان ہوا تو سقراط نے اس سے کہا کہ آؤ میں بتاتا ہوں کہ نیکی کہاں سے ملے گی اور پھر یہاں وہ نیکی کے بارے

میں نوجوان سے گفتگو کرتا ہے۔اس کا روزمرہ کا اصول یہ تھا کہ وہ اگورا(Agora)یا بازار کے لئے چوک میں آجاتا تھا اور یہاں آتے جاتے لوگوں سے سوال کرتا تھا۔میرا خیال ہے کہ شاید لوگ اس ڈر سے کہ ان سوال نہ کر بیٹھے،اس سے الگ ہٹ کر ہی چلتے جاتے ہوں گے۔

سقراط کی اپنی بات کو کہنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کے گھروں پر محفلیں ہوتیں،تو یہ وہاں پر پہنچ جاتا اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیتا۔یونان میں شراب کی محفلوں کو Symposium کہا جاتا تھا۔یہاں پینے پلانے کے ساتھ ساتھ فلسفے پر بھی بحث ہوتی تھی۔ خاص طور پر اگر سوفسطائی (Sophist) محفل میں شریک ہو جاتے تو سقراط سے ان کے مکالمے دلچسپ صورت اختیار کر لیتے۔

سقراط کے بارے میں ہمیں تین ماخذوں سے معلومات ملتی ہے۔اس وقت کے ڈرامہ نگار ارسٹوفینز (Aristophanes) نے اپنے ایک ڈرامے Cloud میں اس کا مذاق اڑایا ہے۔اسی کا کہنا ہے کہ سقراط اپنے فلسفے کے ذریعے غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط کر سکتا ہے۔دوسرا ماخذ اس کے شاگرد Xenophon (زینوفون) کی کتاب ہے۔اور تیسرا ماخذ افلاطون کی Republic ہے۔افلاطون نے Republic میں جو مکالمے دیے ہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کتنے سقراط کے ہیں اور کتنے خود افلاطون کے۔لیکن ان مکالمات میں جو فلسفیانہ مباحث ہیں وہ آج بھی اس طرح سے بحث و مباحثہ کے موضوعات ہیں۔مثلاً ایک بحث میں جب سقراط یہ سوال کرتا ہے کہ انصاف کیا ہے تو ایک سوفسطائی اس کا جواب دیتا ہے کہ سقراط جس کے پاس طاقت ہے اس کے پاس انصاف ہے۔وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوتا تو ایک دوسرا شریک گفتگو کہتا ہے کہ ''انصاف یہ ہے کہ دوستوں سے محبت کی جائے اور دشمنوں سے عداوت'' سقراط اس پر بھی مطمئن نہیں کیونکہ جب نفرت اور عداوت کے جذبات آجائیں تو وہ انصاف نہیں رہتا۔ایک تیسرے صاحب نے یہ رائے دی کہ انصاف یہ ہے کہ انسان اپنے مفادات کا تحفظ کرے،سقراط اس کو بھی خود غرضی کہہ کر مسترد کر دیتا ہے اور پھر انصاف کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اس کا اصل مقصد نیکی ہونا چاہیے۔اپنے لیے نہیں بلکہ سماج کے لیے۔'' اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انصاف کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتا ہے اور انسان سماج کی بہبود کے لئے اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بلند اقبال

سقراط کے بارے میں ہم ابھی کچھ اور بھی جاننا چاہیں گے کیونکہ سقراط نے ایک بار کہا تھا کہ ''اگر زندگی کا تجزیہ نہ کیا جائے'' تو وہ بے سود ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

سقراط نے اپنے فلسفے کو زبانی بیان کیا ہے، لکھا نہیں ہے وہ تحریر کے سخت خلاف تھا کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ اگر کسی چیز کو لکھ دیا جائے تو پھر اس میں ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کا فلسفہ اس کے شاگردوں نے لکھا اس نے خود نہیں لکھا۔ سقراط کے اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے اس کے بارے میں کافی غلط فہمیاں مشہور ہوگئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایتھنز کے دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا ہے اور نوجوانوں کو اپنے نظریات سے گمراہ کرتا ہے۔ لیکن کچھ مورخوں کا خیال یہ تھا کہ جمہوریت سے پہلے ایتھنز میں جب آمرانہ حکومت تھی تو اس وقت سقراط کے کئی شاگرد اس میں شریک تھے۔ اس لیے اس پر ان الزامات کے ساتھ مقدمہ چلایا گیا۔ ایتھنز میں دستور یہ تھا کہ مقدمے کی سماعت جیوری کے ذریعے ہوا کرتی تھی جو مقدمے سے پہلے منتخب ہوتے تھے۔ اس کے مقدمے میں جیوری کے 601 ارکان تھے۔ اپنے اوپر لگنے والے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے سقراط نے ایک تو یہ حوالہ دیا کہ Delphi (ڈیلفی) کے مندر میں اپالو (Apollo) نے اس کو یونان کا سب سے زیادہ عقلمند آدمی کہا تھا حالانکہ وہ خود اس سے متفق نہیں تھا۔ دوسرے اس نے Aristophones کے ڈرامے Cloud کا ذکر کیا جس میں اس کا مذاق اڑایا گیا تھا اور جس نے اس کے بارے میں لوگوں میں غلط تاثر پیدا کیا۔ اس نے یہ دلیل بھی دی کہ وہ دیوی، دیوتاؤں کے خلاف نہیں اور نہ ہی وہ نوجوانوں کو خراب کرتا ہے۔ پہلی سماعت میں جیوری کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ جرمانہ دے کر سزا سے بچ جائے یا جلا وطن ہو

جائے یا سزائے موت قبول کرے۔لیکن دوسری سماعت میں سقراط نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لئے رقم نہیں تھی کسی اور سے یہ رقم لے کر وہ رہائی پانے پر تیار نہ تھا۔اس نے جلاوطنی سے بھی انکار کر دیا کہ جب ایتھنز ہی میں اس کی عزت نہیں تو کسی دوسرے شہر میں اسے کون پوچھے گا۔اس کے برعکس اس نے عدالت سے کہا کہ چونکہ اس نے ایتھنز میں خدمات سرانجام دی ہیں، اس کے دفاع میں جنگوں میں لڑا ہے اور لوگوں کو تعلیم دی ہے۔اس کے عوض اسے شہر کے پبلک کچن کی جانب سے اعزازی طور پر دو وقت کا کھانا دیا جائے۔اس پر جیوری کے اراکین ناراض ہوگئے اور انہوں نے اکثریت سے اس کی موت کے بارے میں فیصلہ دیا جسے اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔

اس کی موت ایک مہینے کے لیے اس لئے ملتوی رہی کہ اہلِ ایتھنز کوئی مذہبی جشن منا رہے تھے لیکن جس دن اس کو زہر کا پیالہ پینا تھا۔اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کی، اپنی بیوی کو جلد ہی رخصت کر دیا کہ عورتیں جذباتی ہوتی ہیں اور رو کر محفل کو افسردہ کر دیتی ہیں۔اس کے شاگردوں نے اگرچہ یہ انتظام کر لیا تھا کہ اسے جیل سے فرار کروا دیا جائے مگر اس نے یہ قبول نہیں کیا کیونکہ وہ قانون کی پابندی چاہتا تھا۔

آخر دم تک وہ اپنے دوستوں سے فلسفیانہ گفتگو کرتا رہا اور اس بات کا اظہار کرتا رہا کہ زیرزمین دنیا (Underworld) میں وہ یونان کے مشہور لوگوں سے ملے گا۔زہر کا جام پی کر اس نے چہل قدمی کی اور پھر لیٹ کر آخری بات اس نے اپنے شاگرد سے یہ کہی کہ میری جانب سے Asclepius کو ایک مرغ کی قربانی دے دینا۔''

افلاطون کو اپنے استاد کی موت کا بہت رنج تھا۔کیونکہ یہ فیصلہ ایتھنز کی جمہوری حکومت میں ہوا تھا لہٰذا وہ جمہوریت کے خلاف ہوگیا۔اس نے Republic میں ایک Utopia پر مبنی جمہوریت کا جو نقشہ کھینچا ہے۔اس کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ یہ کتنا سقراط کا ہے اور کتنا افلاطون کا۔

اس Utopia میں تین طبقوں کی نمائندگی بتائی جاتی ہے۔حکمران، کاریگر اور عوام،

ان تینوں طبقوں کے لوگوں کے لئے یہ لازمی سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ذمے جو فرائض ہیں انہیں وہ پوری طرح سے انجام دیں۔ یہاں پر افلاطون دو مثالیں پیش کرتا ہے۔ جس سے ریاست اور معاشرت کے بارے میں ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ ایک مثال میں وہ کہتا ہے کہ ریاست کو ایک جہاز کی طرح سمجھنا چاہیے۔ جہاز کے سردار کو جہاز کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ محض اپنی خاندانی یا ذاتی اثر رسوخ سے اس کا کپتان بن جاتا ہے اس کے اردگرد جو افراد ہیں وہ خوشامدی ہیں اور اس کی تعریف و توصیف کرنے میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ ایک دانشمند اور عقلمند کپتان ہے۔ جہاز کے مسافر ایک جانب شور مچانے میں مصروف ہیں اور اس سے بے خبر ہیں کہ ان کا کپتان کون ہے اور کیا وہ جہاز کو منزل تک پہنچا بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکمران نااہل ہوں اس کے مصاحب خوشامدی اور عوام جاہل تو اس صورت میں ملک کی تباہی و بربادی لازمی ہوگی۔ دوسری مثال وہ ایک غار کی دیتا ہے جس میں لوگ زنجیروں سے بندھے بیٹھے ہیں۔ سامنے دیوار پر کچھ جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں جنہیں وہ اصل سمجھ رہے ہیں۔ ان میں سے جب ایک شخص کسی طرح زنجیر توڑ کر غار سے باہر جاتا ہے اور وہ سورج کی روشنی اور ماحول کی وسعتوں کو دیکھتا ہے تو وہ واپس آ کر زنجیر میں بندھے ہوئے لوگوں سے کہتا ہے کہ اپنی زنجیریں توڑو اور آزاد ہو کر غار سے نکلو مگر کوئی اس بات پر توجہ نہیں دیتا بلکہ لوگ غصے میں آ کر اسے قتل بھی کر دیتے ہیں۔ اس مثال کے ذریعے افلاطون اپنے استاد سقراط کا ذکر کرتا ہے کہ جو لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی جانب لے جانا چاہتا ہے مگر لوگ اس کے لئے تیار نہیں۔ وہ جس حالت میں ہیں اسی میں رہنا چاہتے ہیں اور کسی بھی طرح تبدیلی کے خواہشمند نہیں ہیں۔

بلند اقبال

افلاطون نے جمہوریت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ وہ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

افلاطون نے جمہوریت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ اول تو معاشرے کی طبقاتی تقسیم کو مستحکم رہنا چاہیے۔ دوسرا اس کا کہنا ہے کہ ایک گروہ کو حکومت چلانے کے لئے منتخب کرنا چاہیے۔ اس گروہ کو وہ Guardian of Democracy یا جمہوریت کا نگہبان کہتا ہے۔ جب ان کو منتخب کر لیا جائے تو پھر نہ تو ان کو ہٹایا جاسکتا ہے نہ ان پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ اور نہ ہی ان کے اختیارات کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ ملک کے حکمران کے لئے اس کا کہنا ہے کہ اسے فلسفی ہونا چاہیے۔ جمہوریت کے نگہبانوں کی کمیونٹی میں عورتوں اور مردوں کے ساتھ برابر کا سلوک ہونا چاہیے۔ بلکہ عورتوں کو بھی حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ یہ ایک لحاظ سے بڑی انقلابی بات تھی کیونکہ یونان کے سماج میں عورت کا مقام گرا ہوا تھا اور اس کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ یہاں تک کہ وہ ووٹ بھی نہیں دے سکتی تھی لیکن افلاطون اسے مردوں کے برابر درجہ دیتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جمہوریت کے نگہبانوں کو ایک برادری یا کمیون کی شکل میں رہنا چاہیے جہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان شادی بیاہ کا کوئی سلسلہ نہ ہو۔ بچے سب کمیون میں رہنے والوں کے ہوں اور ان کے لئے نجی جائیداد کے رکھنے پر پابندی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس صورت میں نگہبان طبقہ اقربا پروری سے دور رہے گا اور نجی جائیداد کے نہ ہونے سے وہ بد عنوانیوں سے بھی پرہیز کرے گا۔ لیکن وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ نگہبان بااختیار ہوں گے، سنسر شپ (Censorship) لگانے کا حق بھی رکھتے ہوں گے اور ہر مخالفت کو ختم کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہوگا۔ اسی وجہ سے رسل (Russell) نے اپنی کتاب History of Western Philosophy میں افلاطون کے اس نظام کو فاشسٹ (Fascist) کہا ہے کارل پاپر (Karl Popper) نے بھی اپنی کتاب Open Society and its enemies میں اسے آزاد معاشرے (Open Society) کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔ یہاں پر اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا نازی حکومت اور دوسری آمرانہ حکومتوں نے افلاطون کے اس نظریے پر عمل کیا۔

بلند اقبال

افلاطون نے ہیئت (Form) کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

افلاطون کے نظریے کے تحت اس دنیا میں تو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اوپر آسمان پر جو دنیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے۔ اسی بات کو رافیل (Raphael) نے اپنی ایک پینٹنگ میں اس طرح دکھایا ہے کہ افلاطون اور ارسطو دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ افلاطون اوپر کی جانب اشارہ کر رہا ہے جبکہ ارسطو زمین کی جانب یعنی کہہ رہا ہے کہ اوپر کی بجائے نیچے دیکھو اصل حقیقت یہاں ہے۔ ارسطو افلاطون کا شاگرد رہا تھا اور اس کی قائم کردہ Academy میں 20 سال تک زیر تعلیم رہا تھا لیکن ایک اچھی تعلیم کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے نظریات کو چیلنج کرتا ہے۔ اور یوں علم کو آگے بڑھاتا ہے۔

بلند اقبال

افلاطون کے بعد ارسطو کے بارے میں ہم آپ سے کچھ معلومات لینا چاہیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

ارسطو نے اپنے استاد افلاطون کے فلسفے کی سخت مخالفت کی ہے۔ خاص طور پر سے اس کے جمہوری نظام پر۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ معاشرے میں خاندان کا ہونا ضروری ہے اور بچوں کی تعلیم و تربیت بھی ماں باپ کے ذریعے ہی بہتر ہوتی ہے۔ وہ عورتوں کو مردوں کے برابر مقام بھی دینے کے حق میں نہیں تھا اور عورتوں کو ناقص العمل سمجھتا تھا کہ اگر ان کو حکومت کا حق دے دیا گیا تو اس سے بربادی آئے گی وہ اس بات کا بھی ناقد تھا کہ جمہوریت کے نگہبانوں کو مکمل اختیارات دیئے جائیں اور معاشرے کی آزادی کو ختم کر دیا جائے۔ وہ اس کا بھی قائل تھا

کہ نجی جائیداد کا ادارہ لازمی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ محنت کرتے ہیں۔ اپنی جائیداد کو آگے بڑھانے میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہیں اور معاشرے کو متحرک رکھتے ہیں۔ افلاطون کی جمہوریت کے برعکس وہ اس بات کا حامی تھا کہ سیاست میں متوسط طبقے کو زیادہ سے زیادہ شرکت کرنی چاہیے کیونکہ یہ تعلیم یافتہ بھی ہوتا ہے اور باشعور بھی۔ اس کا یہ نظریہ موجودہ زمانے میں بھی مقبول رہا۔ متوسط طبقے نے سیاست میں حصہ لے کر جدید دور میں اس کے خیالات کی عملی مثال پیش کی ہے۔

ارسطو افلاطون کے ہیئت (Form) کے نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ مثال دیتا ہے کہ گھر ایک تصور کی شکل میں ذہن میں ہوتا ہے لیکن اس کی تعمیر میں مٹی، لکڑی اور دوسرا مواد شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا تصوراتی شکل اس وقت تک سامنے نہیں آتی جب تک کہ مادی میٹریل سے اس کی تشکیل نہ کی جائے۔

ارسطو نے تقریباً اپنے وقت کے ہر موضوع پر لکھا ہے۔ جس میں بیالوجی، فزکس، سیاست، شاعری، منطق، اخلاقیات اور مابعدالطبیعات بھی شامل ہیں۔ اپنے فلسفے میں اس نے First Canse یا Prime Morer کو بھی کائنات کا خالق بتایا ہے۔ اسی وجہ سے عہد وسطی کے یورپ میں Thomas Aquinas نے اس کے فلسفے کو عیسائیت میں ڈھال کر ایک نئی شکل دی جس کی وجہ سے ارسطو یورپ کے تعلیمی اداروں میں تقریباً ایک ہزار سال تک پڑھایا جاتا رہا۔

اس نے یونان کی تمام ریاستوں کے دساتیر کو بھی جمع کیا تھا تاکہ ان کا مطالعہ کر سکے۔ وہ سکندر کا بھی استاد رہا تھا۔ اس نے ایتھنز میں اپنا تعلیمی ادارہ کھولا تھا جو Lyceum کے نام سے مشہور تھا لیکن جب اس پر بھی ایتھنز میں مقدمہ بنایا گیا تو اس نے شہر چھوڑتے ہوئے یہ کہا کہ وہ ایتھنز کو یہ اعزاز نہیں دینا چاہتا کہ وہ ایک اور اہم فلسفی کو موت کی سزا دے۔

بلند اقبال

ہم ارسطو کے بعد یونان کی دوسری فلسفیانہ تحریکوں کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔

ارسطو کے بعد یونان سے فلسفیانہ تحریکوں کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ مختلف تحریکیں اپنے وقت اور حالات کے تحت ابھرتی رہیں۔ انہی میں سے ایک تحریک Epicurean Philosophy کی تھی جس کا بانی Epicurus تھا۔ اس کے فلسفے کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ یہی دنیا سب کچھ ہے۔ کوئی دیوی دیوتا نہیں، جن کو ماننا چاہیے اور اگر ہیں بھی تو انسانی معاملات سے بہت دور ہیں۔ اس لیے اس دنیا کو بہتر بنانا چاہیے اور سادہ زندگی گزار کر زیادہ سے زیادہ خوشی اور مسرت حاصل کرنا چاہیے۔ وہ خود ایک باغ میں اپنے شاگردوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی غذا روٹی اور زیتون کا تیل ہوتا تھا۔ اگر کبھی پنیر مل جاتا تو یہ اس کی بڑی عیاشی ہوتی تھی۔ اس کے فلسفیانہ خیالات نے آگے چل کر رومی تہذیب کو بھی متاثر کیا۔

فلسفے کی دوسری اہم تحریک رواقیت (Stoicism) تھی۔ چونکہ یہ ایک چھجے کے نیچے ملتے تھے اس لئے اس نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے نظریے کے مطابق انسان کو فطرت کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے۔ زندگی کو ایک نظام کے تحت گزارنا چاہیے۔ رومیوں میں اس سے متاثر ہونے والوں میں سیسرو (Cicero)، سینیکا (Seneca) اور مارکس اوریلیس (Marcus Aurelines) تھے

فلسفے کا تیسرا اہم سکول کلبیت (Cynicism) کا تھا۔ اس کے ماننے والے ترک دنیا کے قائل تھے۔ یہ شادی، بیاہ، جائیداد کسی کو بھی اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اس کا مشہور فلسفی دیوجانس کلبی تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ برہنہ رہتا تھا اور اس کی ذاتی ملکیت میں کچھ نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ مٹی کا ایک پیالہ رکھتا تھا جس سے پانی پیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک بچے کو دریا سے چلو میں پانی پیتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنا پیالہ بھی توڑ دیا۔

سکندر نے جب اس کی شہرت سنی تو اس سے ملنے اسی جزیرے پر چلا آیا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ سردی کا موسم تھا اور وہ دھوپ میں لیٹا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سکندر نے اس کے پاس

پہنچ کر اپنا تعارف کرایا کہ میں سکندر ہوں اور فاتح ہوں۔ دیوجانس نے اس سے کہا۔ ''پھر کیا؟'' اس پر سکندر نے کہا، کیا تم مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوئے؟''

اس نے کہا: ''کیا تم کوئی شیطان ہو کہ جس سے میں ڈروں؟'' یہ سن کر سکندر نے کہا: ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' دیوجانس نے کہا: ''ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں'' کہتے ہیں کہ جب سکندر واپس جا رہا تھا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر میں سکندر نہیں ہوتا تو دیوجانس کلبی بننا پسند کرتا۔

بلند اقبال

یونان کے فلسفے میں سوفسطائیوں کا کیا کردار رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سوفسطائی فلسفیوں کا ایک ایسا گروہ تھا جو چوتھی صدی عیسوی میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کا ہم عصر تھا۔ یہ فلسفی خاص طور پر امرا کے بچوں کو سیاسی اور فلسفیانہ معاملات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس وقت فنِ خطابت ایک اہم فن تھا جس کے ذریعے سیاستدان لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے تھے لہٰذا سوفسطائی فن خطابت اور منطق کی تعلیم دے کر اپنے شاگردوں کو سیاست کے اصول سمجھاتے تھے کہ کس طرح سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جائے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ کچھ ہمارے آج کے سیاستدان بھی کرتے ہیں۔ سوفسطائیوں کی خاص بات یہ تھی کہ یہ تعلیم کا معاوضہ وصول کرتے تھے اس لیے سقراط ان کا سخت مخالف تھا کیونکہ اس کے نزدیک علم کا کوئی معاوضہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے جو سوال کیا ہے کہ یونانی فلسفے کو ہم آج کے ماحول میں کس طرح دیکھتے ہیں تو ایک تو افلاطون نے جو جہاز اور اس کے کپتان کی مثال دی تھی وہ آج ہمارے ملک پر بھی پوری اترتی ہے۔ کیونکہ ہمارے سربراہ علم و دانش سے آزاد ہیں خوشامدی ان کے گرد ہیں اور عوام جاہل ہیں۔ یہ تینوں باتیں ملک کو تباہی کی جانب لے جا رہی ہیں۔ اس طرح اس نے غار کی جو مثال دی ہے، اس میں وہ فلسفی اور دانشور جو معاشرے کو

تاریکی سے روشنی کی طرف لانا چاہتے ہیں انہیں ملک کا دشمن قرار دے دیا جاتا ہے تیسری بات یہ ہے کہ ہیراکلیٹس (Heraclitus) کے تبدیل ہونے والے نظریے کی بجائے Parmenides کے Monism کے نظریے کو صحیح مانا جاتا ہے اور ہم اس پر بضد ہیں کہ سچائی صرف ہمارے پاس ہے۔ ہمارے علاوہ سب گمراہ ہیں۔

بلند اقبال

یونانی فلسفے نے مادی اور روحانی طور پر کیا سبق دیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

یونانی فلسفیوں کے ہاں ہمیں روحانیت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اس دنیا کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو کس طرح نیکی کی زندگی گزارنی چاہیے مسرت کو حاصل کرنا چاہیے اور ذہنی ترقی کرنی چاہیے۔

ان کے فلسفے کے یہ اثرات ہم آنے والے ادوار میں دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس بات کو سمجھا کہ ادارے، روایات اور رسوم و رواج بدلتے رہتے ہیں لہٰذا ان فرسودہ قدروں کو اگر تبدیل کیا جائے تو یہ ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس بات پر بھی زور ہے کہ سچائی ایک نہیں کئی ہوتی ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یونان کے معاشرے نے فلسفے سے محبت کی، اس کی مدد سے عقل اور دانشمندی کے ساتھ اپنے مسائل کو سمجھا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششیں کی لہٰذا ہمارے لیے یہ پیغام ہے کہ ہم جذباتی نظریات کی بجائے فلسفے کا مطالعہ کریں اور ایسے فلسفی پیدا کریں جو اپنے حالات کو سمجھتے ہوئے اس دنیا کو بہتر بنانے کے لئے نظریات فراہم کریں۔

☆.....☆.....☆

6- ہندوستانی فلسفہ

بلند اقبال

پچھلی مرتبہ ہم نے یونانی فلسفہ پر بات کی تھی جو کہ مغربی فلسفے کی بنیاد ہے۔ مشرقی فلسفے کے سلسلے میں آج ہم ہندوستانی فلسفے پر بات کریں گے۔ چونکہ ہمارے پاس وادی سندھ کی تہذیب کے شواہد نہیں ہیں اس لئے ہم ہندوستانی فلسفے کو آریائیوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع کریں گے کہ جب وہ یہاں آباد ہوئے تو اُنہوں نے اس کائنات اور انسان کے بارے میں غور وحوض کر کے فلسفیانہ افکار کو جنم دیا اس موضوع پر ہمارے ساتھ گفتگو کے لئے پروفیسر ڈاکٹر مبارک علی ہیں، میں چاہوں گا کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈالیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا شکریہ کہ اپنے ان علمی موضوعات پر پروگرام شروع کئے ورنہ عام طور پر ہمارے ہاں ٹی وی چینلز پر سیاست کے علاوہ اور کوئی علمی بات نہیں ہوتی ہے۔ تو وادی سندھ کو چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ یہ ایک الگ موضوع ہے اور ہمارے پاس اس کی کوئی تحریری تاریخ بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم ہندوستانی تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ تو اس میں صرف فلسفہ ہی نہیں آتا بلکہ مذہب، ثقافت اور سماج کی دوسری سرگرمیاں بھی آتی ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی فلسفے کی شروعات اس وقت سے ہوتی ہے۔ جب 1500 قبل مسیح میں یہاں آریا آ کر آباد ہوئے۔

کیونکہ سب سے پہلے یہ پنجاب میں آ کر بسے اس لیے ان کی پہلی مذہبی کتاب ''رگ وید'' ہے۔ رگ کے معنی 'تعریف' کے ہیں اور وید کے معنی 'علم' کے ہیں یعنی علم کی تاریخ کیونکہ یہ ان کی پہلی کتاب ہے اس لئے اس میں ہمیں آریاؤں کے رسم ورواج عقائد اور ان کی سماجی ساخت کے بارے میں بہت معلومات ملتی ہیں۔ اس کے بعد تین (3) وید اور لکھے گئے۔ یعنی اتھر وید، سام وید، یجر وید۔ ان چاروں ویدوں میں آریائی دیوی دیوتاؤں کی عقیدت میں بھجن اور گیت ہیں وید سنسکرت میں لکھے گئے ہیں۔ رواج یہ تھا کہ برہم ذات کے پجاری جن کا کام مذہبی رسومات ادا کرنا تھا۔ وہ ان ویدوں کو زبانی یاد کرتے تھے اور ان کے لئے لازمی تھا کہ الفاظ کی ادائیگی صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کریں۔ لہٰذا نسل درنسل زبانی یاد کرنے کی یہ رسم جاری رہی ۔تقریباً پچاس صدی قبل مسیح میں ان ویدوں کو تحریری شکل دی گئی۔ لہٰذا یہ چاروں وید ہندو مذہب اور فلسفے کی بنیاد ہیں۔

ہندوستان کے فلسفوں نے اس مادی دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے اصولوں کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کے چار اصول انتہائی اہم ہیں جو ان کے مذہب اور فلسفے کی تشریح کرتے ہیں۔ پہلا عقیدہ سنسارا کہلاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ دوسرا اصول _____ کہلاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے انسان کو اس دنیا میں اپنی زندگی کیسے گزارنا چاہیے، کن باتوں پر عمل کرنا چاہیے کن باتوں کو چھوڑنا چاہیے۔ اور تیسرا اصول دھرمہ کہلاتا ہے۔ یعنی جس کے ذمہ جو کام ہے اسے دیانت کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہندو سماج میں ذات پات تھی اس لئے ہر ذات والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی ذات کو دھرمہ سمجھتے ہوئے اس سے وابستہ جو پیشے ہیں ان پر عمل کریں۔ یعنی کشتری کا کام لڑنا ہے۔ لہٰذا جنگ کرنا اس کا دھرمہ ہوا۔ چوتھا اصول موکشہ کہلاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ اگر فرد اپنے فرائض پوری طرح سے ادا کرے گا تو اسے موکشہ مل جائے گی اور وہ بار بار جنم لینے کے عذاب سے بچ جائے گا۔ یہ چار بنیادی فلسفیانہ اصول تھے کہ جن کی بنیاد پر ہندوستانی سماج کی تشکیل ہوئی تھی۔

چونکہ حالات و زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ لوگوں کی ضروریات بھی بدلتی ہیں اور

لوگوں کے عقائد میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ لہٰذا جہاں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پرانا علم ساتھ نہیں دیتا ہے تو اس کی جگہ نیا علم تخلیق ہوتا ہے۔ مذہب کی نئے سرے سے تشریح کی جاتی ہے اور فلسفیانہ افکار بدلتے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ویدوں کے بعد جو نئی کتابیں لکھی گئیں وہ اُپنشد ہیں۔ جس کے معنی ہیں قریب ہو کر بیٹھنا یعنی شاگرد کا اپنے گرو کے ساتھ بیٹھنا اور اُس سے فیضیاب ہونا۔ یہ کتابیں مکالمے کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی سوال کیا جاتا ہے اور پھر اُس کا جواب دیا جاتا ہے۔ ان مکالموں میں فلسفیانہ امور کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان اُپنشدوں کے لکھنے والوں میں برہمنوں کے علاوہ دوسری ذات کے لوگ بھی شامل ہیں یہاں تک کہ شودر بھی، عورتوں نے بھی ان کے لکھنے میں حصہ لیا ہے۔ ان کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں وہ پران کہلاتی ہیں۔ ان میں راجوں' مہاراجوں اور عام لوگوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

اس کے بعد مہا بھارت آئی ہے۔ جس میں کوروؤں اور پانڈووں کی جنگ کا حال ہے۔ جنگ کے میدان میں جب پانڈووں کے سردار اَرجن نے دیکھا کہ اُس کے سامنے مخالفین میں اس کے استاد، رشتہ دار اور دوست احباب ہیں تو اس نے تیر کمان پھینک دیا اور لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہاراج کرشن نے جو اس کے رت بان تھے اسے اپنے وعظ میں نصیحت کی۔ یہ وعظ بھگوت گیتا کے عنوان سے مہا بھارت کا ایک حصہ ہے جسے ہندو مذہب کی مقدس کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اپنے وعظ میں اَرجن سے مہاراج کرشن نے کہا کہ اول تو تم ایک کشتری ہو جس کا دھرم لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اگر تم ان کو قتل کرو گے تو ان کا جسم تو ختم ہو جائے گا مگر ان کی روح دوبارہ جنم لے کر اس دنیا میں آ جائے گی چنانچہ جنگ ہوتی ہے اور پانڈو فتح یاب ہوتے ہیں۔

ہندو مذہب کی دوسری کتاب 'رامائن' ہے جس کے مصنف بالمکی ہیں، یہ کہانی تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ رام ان کی بیوی سیتا اور ان کے بھائی تیرہ سال کے لئے بن باس پر چلے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی سیتا کو راوَن اغواء کرتا ہے اور مہاراج ہنومان کی مدد سے اسے واپس

لایا جاتا ہے۔ جب یہ واپس ایودھیا آتے ہیں تو سیتا پہ شبہ کیا جاتا ہے کہ شاید وہ پاک باز نہیں رہی جس پر وہ دیوتاوں سے دعا مانگتی ہے کہ اس کی پاک بازی ثابت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر زمین پھٹی اور وہ اس میں سما گئی۔ اس کے بعد سے سیتا ہندو سماج پاک بازی عصمت اور عفت کی علامت بن گئی۔ ایودھیا وہی شہر ہے جہاں اب رام کی جنم بھومی اور بابری مسجد کا جھگڑا چل رہا ہے۔ رام کے دور حکومت کو انصاف، خوشحالی اور امن و امان کا دور کہا گیا ہے۔ اس لئے رام راجیہ کی اصطلاح ہندوستان کی سیاست میں مقبول ہوگئی ہے۔ ہندو سیاستدان جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے اب سیاستدان رام راجیا کی بات کرتے ہوئے لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ ہندستان کے اس سنہری دور کو واپس لائیں گے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب تک ہم مہابھارت اور رامائن کی بات کرتے رہے ہیں۔ اب ذرا ویدک پیریڈ کے کردار کی بھی وضاحت کر دیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

اس ابتدائی دور کو ہم ویدوں کا عہد کہتے ہیں اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ مثلاً اس زمانے میں کوئی بڑی سلطنتیں قائم نہیں ہوئیں اور نہ ہی عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں، اس کے برعکس ہندوستان کے فلسفیوں، رشیوں اور سادھوؤں نے اس کائنات کے وجود، انسانی زندگی کے مقصد اور روحانی علم کے حصول پر توجہ دی لہٰذا ہمیں اس دور کے ادب میں گہرے فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں۔

ویدوں کے اس عہد میں ہندو سماج میں ذات پات کی تشکیل بھی پوری طرح سے اُبھر کر سماج کی یہ تقسیم کسی نہ کسی شکل میں وہ اپنے ساتھ لائے ہوں اس ابتدائی دور میں اُسے وڈن کہا جاتا تھا جس کے معنی رنگ کے ہیں۔ شائد ہندوستان کے قدیم باشندوں کو جن کا رنگ کالا تھا اور خود آریاؤں کا جن کا رنگ گورا تھا یہ رنگ ان میں تفریق کا باعث بنا۔ ان کی چار

ذاتوں میں ابتدائی دور میں کشتریوں کی حیثیت اول تھی۔ کیونکہ یہ جنگجو تھے اور قوم کی حفاظت کے لئے ان کا وجود ناگزیر تھا لیکن آگے چل کر برہمنوں نے اولین حیثیت اختیار کر لی اور کشتری دوسرے نمبر پر آ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آریا مضبوط اور مستحکم ہو گئے۔ تو برہمنوں نے مذہبی رسم و رواج اور رسومات کے ذریعے وہ حیثیت اختیار کر لی کہ جس میں پیدائش سے لے کر موت تک مذہبی رسومات کے لیے ان کا ہونا لازمی تھا لہٰذا ہندو سماج کی نئی تشکیل میں برہمن دیوتاوں کے سر سے پیدا ہوئے کشتری بازوؤں سے ویش یا کسان رانوں سے اور شودر پاؤں سے۔ ان چار ذاتوں کے علاوہ پانچویں ذات اچھوتوں کی تھی جن کی ہندو مذہب میں کوئی جگہ نہ تھی شاید یہ مقامی باشندے ہوں جنہیں شکست دینے کے بعد غلامی کے حال میں رکھا گیا ہو۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ نے ویدوں کے متعلق تو بتایا لیکن کیا ان ویدوں کے خلاف بھی کوئی فرقے تھے کہ جنہوں نے ان کے عقائد پر تنقید کی ہو یا انہیں چیلنج کیا ہو؟

ڈاکٹر مبارک علی

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جب بھی فلسفیانہ افکار اور مذہبی عقائد قدامت پرستی کا شکار ہو جائیں یا فرسودہ ہو جائیں تو ایسے فرقے سامنے آتے ہیں جو ان پر نہ صرف تنقید کرتے ہیں بلکہ ان کے خلاف متبادل نظریات اور افکار کو بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ویدوں کے عہد ہی میں ظیغون کا ایک گروہ تھا جو چارلوک یا لوکائیتیہ کہلاتے تھے یہ مذہبی عقائد کے منکر تھے نہ روح کے قائل تھے اور نہ ہی بار بار جنم لینے کے، عبادت و ریاضت کرنے اور ترکِ دنیا کر کے روحانی مقام حاصل کرنے کے خلاف تھے وہ اس مادی دنیا ہی کو حقیقت سمجھتے تھے اور اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کے قائل نہ تھے۔ ان کے باغیانہ خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں نے ان کی تحریروں اور تقریروں کو ضائع کر دیا تا کہ ان کا کوئی وجود باقی نہ رہے۔ موجودہ زمانے میں اب جو تحقیق ہو رہی ہے تو محققوں نے چارواک فلسفے کو ترتیب دینے میں ان اقتباسات سے مدد لی

ہے جوان کے مخالفوں نے ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھے تھے۔ چنانچہ بنگال کے ایک مشہور فلسفی دیوی پرشاد چٹوپادھیا نے اپنی کاتب لوکائتیا میں بڑی محنت سے چارلوک فلسفوں کے افکار کو جمع کیا ہے۔اس کے علاوہ چوٹیارھیا کی ایک دوسری کتاب.....

"What is living what is dead in Indian Philosophy!!"

بھی اہم ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلسفے کی بنیاد صرف روحانیت پر نہیں تھی بلکہ یہ مادی معاملات اور مسائل پر بھی غور وفکر کرتا ہے۔

تاریخ میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب مذہب کی ایک ہی شکل قائم رہے۔اس کے عقائد میں سختی آتی جائے اور تبدیل ہوتے ہوئے مسائل سے دور ہوتا چلا جائے تو اس صورت میں دو قسم کے ردعمل سامنے آتے ہیں۔ایک تو کہ مذہب سے انکار کر کے کوئی اور متبادل نظریہ اس کی جگہ لیتا ہے۔ یا پھر مذہب کے اندر نئے فرقے پیدا ہوتے ہیں جو مذہب کی نئی تاویلات کے ذریعے اپنے مقاصد اور ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی کے آتے آتے ویدک عقائد میں سختی آ جاتی ہے۔ برہمنوں کا اثر ورسوخ بڑھ جاتا ہے۔ پیدائش شادی بیاہ اور موت تک اس قدر رسومات ہو جاتی ہیں اور ان کی ادائیگی میں اس قدر اخراجات بڑھ جاتے ہیں کہ ایک عام آدمی کے لئے ان کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس صدی میں برہمنوں کی اجارہ داری کو چیلنج کیا گیا اور دو نئے مذہبی فرقے وجود میں آئے جنہوں نے بعد میں علیحدہ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ان میں ایک جین مت تھا اور دوسرا بدھ مت۔

جین مت کے بانی مہاویر تھے جس کا مطلب ہے عظیم ہیرو۔ ان کا تعلق کشتریہ خاندان سے تھا اور یہ بھی اپنی آوارہ زندگی چھوڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں نکل گئے اور مراقبوں اور ریاضتوں اور تجربات اور مشاہدات کے بعد انہوں نے اپنے مذہب کے عقائد کی تشکیل کی۔ جین مت کے مذہب کو ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ روح صرف انسانوں ہی میں نہیں ہوتی بلکہ یہ جانوروں درختوں اور پتھروں میں بھی ہوتی ہے اس لیے انہوں نے جانوروں کی قربانیاں بند

کر دیں اور کھانے میں گوشت کے بجائے سبزی خور ہو گئے۔ یہ عدم تشدد یا اہنسا کے پیروکار بن گئے کہ کسی ذی روح کو تکلیف نہ پہنچائی جائے یہ اپنے منہ کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں تا کہ کوئی کیڑا مکوڑا منہ میں یا ناک میں نہ چلا جائے۔ کھانا دن کی روشنی میں رات سے پہلے کھا لیتے ہیں۔ اور پاؤں ننگے رکھتے ہیں تا کہ ان کے پاؤں کے تلے کوئی کچلا نہ جائے۔ ان کے مذہب میں سختی کی وجہ سے ان کے ماننے والے بھی کم ہیں۔ مثلاً کسان جین مت کی تعلیمات پر عمل نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کھیتی باڑی کرتے وقت کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کو مارنا پڑتا ہے تا کہ فصلوں کو نقصان نہ ہو۔ اور پرندوں سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح دوسرے پیشہ ور لوگ بھی جین مت کے پیروکار نہیں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کے پیروکار تاجر طبقے کے لوگ ہیں لہٰذا یہ جین مت کے ماننے والے تجارت میں انتہائی ایماندار اور دیانت دار ہیں۔ اس وقت ان کے ماننے والوں کی زیادہ تعداد جنوبی ہندوستان میں ہے۔ جہاں ان کے مَندر بھی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی ان کی آبادیاں ہیں۔ تقسیم سے پہلے لاہور میں جینی لوگ بھی تھے اور ان کا جین مندر بھی۔ جین مت کا رویہ دنیا کے معاملات کے بارے میں یہ ہے کہ یہ دکھ اور تکلیفوں کی جگہ ہے یعنی یہ دنیا اس قابل نہیں کہ اس میں خوشی اور مسرت کے ساتھ زندگی گزاری جا سکے، جین مذہب کا ہندو سماج پر بہت گہرا اثر ہوا۔ گوشت کی جگہ سبزی کھانے کا رواج بھی اس کی تعلیمات کا اثر ہے۔ آہنسہ یا عدم تشدد کے اصول پر عمل کرنا بھی جین مت کی وجہ سے ہے اس لیے یہ ایک علیحدہ سے مذہب بھی رہا اور اس نے ہندوستان کے معاشرے کو تبدیل بھی کیا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب ذرا بدھ مت پر روشنی ڈالیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

جین مت کی طرح بدھ مت بھی برہمنوں کی مذہب پر اجارہ داری اور رسومات کے

خلاف بغاوت تھی جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ گوتم بدھ جن کا اصلی نام سدھارتھ تھا، ایک کشتری خاندان میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کی خواہش تھی کہ انہیں محل سے باہر نہ جانے دیا جائے اس لئے زندگی کی تمام آسائشیں انہیں مہیا کر دی گئیں لیکن ایک دن جب وہ اپنے محل سے نکلتے ہیں تو راستے میں ایک بوڑھے بیمار کو دیکھتے ہیں اور جنازے میں ایک مردہ شخص کو، اس پر انہیں احساس ہوتا ہے کہ محل کی زندگی جو وہ گزار رہے ہیں دنیا کی حقیقتوں سے بہت دور ہے۔ لہٰذا انہیں تجسس ہوتا ہے کہ وہ سچائی کو تلاش کریں تا کہ اس دنیاوی دکھ درد سے نجات پائی جا سکے۔ اس غرض سے ایک دن وہ اپنے محل اور بیوی بچے کو چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ ساھووں، رشیوں اور سنتوں سے ملاقات کر کے سچائی کی تلاش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ عبادت ریاضت اور مراقبے بھی کرتے ہیں اور گیان حاصل ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا وعظ سارناتھ کے مقام پر اپنے پانچ مریدوں کو دیا۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کے مطابق وہ انسان کو اس دنیا کے غموں اور تکلیفوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور روح کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک برائیوں اور خرابیوں کی اصل وجہ انسان کی خواہشات ہیں۔ یہ خواہشات اسے لالچ اور طمع کی جانب لے جاتی ہیں اُسے دولت کے حصول کی ترغیب دیتی ہیں یہ اُسے ذاتی مفادات کے لئے جھوٹ، فریب اور دھوکے کی جانب لے جاتی ہیں۔ یہ اقتدار اور طاقت کے نشے میں اضافہ کر کے ظُلم و جبر اور استحصال کا باعث بنتی ہیں۔ اگر انسان اپنی خواہشات پر قابو پالے یا ان کا خاتمہ کر دے، تو اس کی زندگی خوشگوار اور پُر امن ہو سکتی ہے۔ گوتم بدھ نے زندگی گزارنے کے لئے درمیانی راستہ اختیار کرنے پر زور دیا ہے اور ہر قسم کی انتہا پسندی کو رد کیا ہے۔ اس کی تعلیمات معاشرے میں توازن پیدا کرتی ہیں اور اس کے بگاڑ کو روکتی ہیں۔ بدھ مت ایک طرح سے فلسفہ ہے اس میں عقیدے کی گہرائی اور پابندی نہیں ہے۔

بدھ مت کے ماننے والے جنہوں نے ترک دنیا کر دیا تھا عام لوگوں سے دور غاروں اور عبادت گاہوں میں رہتے تھے یہ لوگ بھکشو کہلاتے تھے۔ ابتداء میں عورتوں کو جماعت میں شامل نہیں کیا جاتا تھا اور یہ بھکشنے کہلاتی تھیں یہ عبادت کرتے تھے اور بھیک میں جو بھی مل جاتا

تھا اسے کھا کر گزارا کر لیتے تھے۔ آگے چل کر جب حکمران، اُمراء اور تاجروں نے بدھ مت اختیار کیا تو انہوں نے بھکشوؤں کی عبادت کے لئے پہاڑوں کے غاروں کو منتخب کیا۔ اور اس مقصد کے لئے اسٹوپا تعمیر کرائے جگہ جگہ پر جہاں گوتم بدھ کے بال، ناخن یا دانت میں سے کوئی نہ کوئی چیز دفن کر کے یادگار بنا دیتے تھے۔ بدھ مت کے یہ اسٹوپا آج بھی پاکستان کے کئی شہروں میں موجود ہیں خاص طور پر موہنجوڈارو کا اسٹوپا بہت مشہور ہے۔

بلند اقبال

کیا یونانی اور ہندوستانی فلسفے میں کوئی مماثلت ملتی ہے اور کیا ایسے شواہد ہیں کہ تاریخ میں ان کے باہمی رابطے رہے ہوں؟

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں ہمیں ایسے شواہد تو نہیں ملتے کہ یونانی اور ہندوستانی فلسفیوں کے درمیان ملاقاتیں ہوں یا یہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے ہوں لیکن ایسی روایات ضرور موجود ہیں کہ جیسا فیثا غورث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان آیا تھا اور آواگون کے ہندو عقیدے سے متاثر ہو کر اسے اپنا لیا تھا۔ مثلاً اس کے بارے میں یہ کہانی مشہور ہے کہ ایک بار کوئی شخص ایک کتے کو مار رہا تھا تو یہ دوڑ کر اس شخص کے پاس گیا اور کہا کہ اس کتے کو نہ مارو کیونکہ یہ میرے دوست کا دوسرا جنم ہے۔ اسی طرح دیوجانس قلبی برہنہ رہتا تھا۔ تو جین مت کے بانی مہاویر بھی لباس کا استعمال نہیں کرتے تھے تو اس قسم کی مماثلت تو مل جاتی ہے۔

لیکن مورخین جب چھٹی اور پانچویں صدی عیسوی میں پیدا ہونے والے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس وقت ان سب کی تعلیمات میں جن میں جین مت اور بدھ مت اور زرتشت شامل ہیں، تو ان سب میں دنیا کے بارے میں جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا رنج و اَلم کی جگہ ہے اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کو ترک کر دے، نہ شادی بیاہ کرے، نہ بچے پیدا کرے، نہ جائیداد رکھے اور نہ ہی دنیاوی آسائشیں حاصل کرے بلکہ ایک سادہ زندگی گزار کر

یہاں سے چلا جائے۔

بلند اقبال

اب میرا سوال یہ ہے کہ ہندو مذہب میں جو بتوں کی پوجا کی جاتی ہے تو کیا یہ محض علامتی ہے جیسے اگر کسی بت کے بہت ہاتھ بنائے جائیں تو یہ طاقت کو ظاہر کریں گے اگر بہت آنکھیں دکھائی جائیں تو یہ دنیا کو مختلف انداز میں دیکھنے کا پیغام دیں گی۔لیکن ہم اسے بت پرستی کہہ کر ان علامتوں کو نہیں دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی یہ بات برہمن مت یا ہندومت پر صادق آتی ہے۔لیکن بتوں کے پیچھے ہندو مذہب کا گہرا فلسفہ موجود ہے۔ان کے ہاں برہما کا وجود بھی ہے جس نے اس کو تخلیق کیا ہے لہٰذا ہندو مذہب میں لاکھوں کی تعداد میں دیوی اور دیوتا ہیں۔جن کی پوجا مختلف فرقے اپنے انداز میں کرتے ہیں اور ان کے فلسفی روحانی درجات بلند کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہندو دھرم میں بہت دیومالائی قصے ہیں بھجن ہیں، گیت ہیں اور اشلوک ہیں۔جو عقیدت مندوں کو اپنی دلکشی اور جاذبیت میں گرفتار کر لیتے ہیں۔بدھ مت میں گوتم بدھ کے بت بنانے کا رواج کنشک کے دورِ حکومت میں ہوا،لیکن ہندوستان میں جگہ جگہ ان کی عبادت گاہیں ہیں۔جدید دور میں جب اجنتا اور ایلورا کے غار دریافت ہوئے تو ان میں جو بھکشوؤں کی بنائی ہوئی تصاویر ملی ہیں وہ آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

لیکن وقت کے ساتھ بدھ مت ہندوستان میں کمزور ہوتا چلا گیا اور ہمسایہ ملکوں میں اس کا پھیلاؤ ہوا۔باہر کے ملکوں میں اس کی تبلیغ اشوک کے زمانے میں ہوئی جب اس نے بدھ مبلغوں کو سری لنکا اور دوسرے ہمسایہ ملکوں میں بھیجا یہ آگے چل کر چین، تھائی لینڈ، ویت نام، اور جاپان میں مقبول ہوا۔ ہندوستان میں جب گپت خاندان اقتدار میں آیا تو اس نے دوبارہ سے برہمن ازم کی سرپرستی کی۔سنسکرت زبان کا احیاء ہوا،منوشاستر میں ہندوؤں کے سماج کے

بارے میں قوانین مرتب ہوئے۔ سنسکرت ادب کا فروغ ہوا اس کی وجہ سے بدھ مذہب آہستہ آہستہ ہندوستان سے ختم ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس زوال کے وقت بھی چین سے بدھ عالم خصوصیت سے ہندوستان آتے تھے اور یہاں سے بدھ مت پر لکھی گئیں کتابیں لے جا کر ان کا ترجمہ کرتے تھے۔ صوبہ بہار میں بدھوں کی سب سے بڑی یونیورسٹی نالیندا تھی اس یونیورسٹی کو 1213ء عیسوی میں بختیار الدین خلیجی نے بنگال پر حملہ کرتے وقت مسمار کر دیا اور اس میں رہنے والے بھکشوؤں کا قتل عام ہوا۔

موجودہ دور میں بدھ مذہب کی مقبولیت مغربی ملکوں اور امریکہ میں بڑھتی جا رہی ہے۔ جہاں اسے بطور فلسفہ لیا جاتا ہے کہ کوئی عیسائی یا یہودی ہوتے ہوئے بھی بدھ مت کا پیروکار ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی دلت رہنما ڈاکٹر امیدکر جنہوں نے ہندو دھرم میں اچھوت لوگوں کے لئے کوئی عزت و احترام کی جگہ نہ پائی تو انہوں نے بھی اپنے تین ہزار آدمیوں کے ساتھ بدھ مت کو اختیار کر لیا تھا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ہندو مذہب کو موجودہ زمانے میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

دنیا کی تاریخ میں جہاں نظریہ سوچ اور فکر بدلتی رہتی ہے اس کے ساتھ مذاہب بھی ایک جگہ ٹھہرے ہوئے نہیں رہتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مثلاً ابتداء میں آریا گائے کا گوشت کھاتے رہتے تھے۔ حال ہی میں دہلی یونیورسٹی کے ایک مورخ نے ویدوں سے لئے گئے حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ ابتدائی دور میں گائے کو مقدس نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ گوشت سے پرہیز اور سبزی کھانے کا رواج جین مت کی وجہ سے ہوا اب جب ہم ہندو مذہب کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو یہ بھی برطانوی دور کی ہے۔ کیونکہ یہودیت، عیسایت اور اسلام کی طرح سے ہندو مذہب کوئی ایسا مذہب نہیں کہ جس

کی کوئی ایک شکل ہو۔اس میں لاتعداد فرقے ہیں۔ لاکھوں دیوی دیوتا ہیں اس لئے اسے سامی مذاہب کی طرح نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔یعنی یہ مشنری مذہب نہیں ہے۔اور جیسا کہ ایک فلسفی نے کہا ہے کہ جن مذاہب میں کئی دیوی دیوتا ہوتے ہیں مذہبی طور وہ انتہا پسند نہیں ہوتے ہیں اور اگر موقع ہوتو وہ دوسرے دیوی دیوتاؤں کو بھی اپنا لیتے ہیں۔لیکن جو ایک دیوتا کو مانتے ہیں وہ اس کی ذات میں کسی کو شامل کرنے کا نہیں سوچتے اس لیے مذہبی طور پر تنگ نظر ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں بی جے پی اور ہندو انتہا پسند ہندو دھرم کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اسلام اپنے سارے ماننے والوں کو متحد کرتا ہے۔ ہندو دھرم بھی اس طرح سے تشکیل کیا جائے۔ لہٰذا اس کوشش نے رام جنم بھومیکا بحران پیدا کیا۔ بابری مسجد کو مسمار کیا اور اس کی جگہ اب مندر بنانے کا منصوبہ ہے۔اس کے بعد رتھ یاترا کے ذریعے ہندو علاقوں کو دوبارہ سے سامنے لایا گیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد بے جے پی کی حکومت نے گاؤکشی پر پابندی عائد کی ہے۔جگہ جگہ مندر بنا کر مذہبی ماحول کو زور وشور سے منایا جانے لگا ہے۔اس سب اقدامات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ریاست کو ہندو دھرم میں ڈھالا جائے۔اب یہ سوال ہے کہ اس مقصد میں انہیں کہاں تک کامیابی ہوگی۔

بلند اقبال

کیا ہندوستان اور پاکستان میں جو مذہبی انتہا پسندی ہے وہ ہمیں کسی سمت لے جارہی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان میں برطانوی دور سے ہی ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات کی ابتداء ہوچکی تھی یہ فسادات تقسیم کے وقت اپنی انتہاء کو پہنچے لیکن آزادی کے بعد بھی ہندوستان ان فرقہ وارانہ فسادات سے پوری طرح نہیں نکل سکا ان میں سب سے بدترین فسادات گجرات کے تھے جہاں اُس وقت مودی کی حکومت تھی اور حکومت کے کارندوں کے ساتھ وہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا

کیونکہ جمہوریت کا المیہ یہ ہے کہ ووٹ لینے کی خاطر سیاسی جماعتیں لوگوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرتی ہیں اور نفرت کے ذریعے اپنے مقبولیت کو بڑھاتی ہیں، ہندوستان میں بی جے پی (BJP) پارٹی کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی مذہب کو سیاست میں استعمال کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ استحصال اور دہشت گردی ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اس سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

7- فلسفہء اسلام

بلند اقبال

آج کے پروگرام میں ہم فلسفۂ اسلام پر بات کریں گے۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کنفیوژن کو دور کیا جائے جو مذہبی فلسفے اور فلسفے میں ہے۔ کیونکہ جب فلسفے کو مذہب سے جوڑ دیا جاتا ہے۔تو اس کا مقصد ہوتا ہے کہ خدا کے وجود اور مذہبی عقائد کو ثابت کریں جبکہ اس کے برعکس فلسفے کی بنیاد عقلیت اور دلیل پر ہوتی ہے۔ یہ فرق مجھے اس وقت نظر آیا جب ہم نے یونانی اور ہندو فلسفے پر پروگرام کئے تھے۔ یونانی فلسفے کی بنیاد عقل پر ہے جبکہ ہندو فلسفہ مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ آج ہم جب فلسفۂ اسلام پر بات کریں گے تو اس پر بحث کریں گے کہ کیا اسلامی معاشرے میں فلسفہ اور مذہب آپس میں ملے ہوئے ہیں یا علیحدہ علیحدہ ہیں۔ میرے ساتھ اس پر روشنی ڈالنے کے لئے پروفیسر ڈاکٹر مبارک علی ہیں میں ان سے یہ سوالات کر کے موضوع کی وضاحت چاہوں گا۔

ڈاکٹر مبارک علی

جہاں تک مذہب اور فلسفے کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد عقیدے پر ہوتی ہے اور عقیدے پر ایمان لانے کے لئے کبھی عقل یا دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں فلسفے کا تعلق عقل اور دانش مندی سے ہے یہ کسی بھی مسئلے کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک عقل اس کا جواز فراہم نہ کر دے۔ اس کے علاوہ

فلسفہ شک و شبہے کو پیدا کرتا ہے سچائی کی جستجو میں رہتا ہے۔ مکمل سچائی کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اگر پہلے سے قائم شدہ سچائی غلط ثابت ہو جائے تو وہ اس تبدیلی پر بھی تیار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں جو عالم و فاضل دلیل کے ذریعے مذہب کو سچا قرار دیتے ہیں تو انہیں فلسفی نہیں کہا جاتا یہ متکلم کہلاتے ہیں اور ان کے علم کو الکلام کہا جاتا ہے۔ اب میں یہاں آپ کو تاریخ سے مثال دے کر بتاؤں گا کہ مذہب کو فلسفے سے ڈر اور خوف رہتا ہے اس لیے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ فلسفے کے وجود کو نہ رہنے دیا جائے۔ اس کی مثال بازنطینی سلطنت کی ہے کہ جب اس نے عیسائیت کو قبول کر لیا اور سلطنت میں چرچ کا اثر ورسوخ بڑھ گیا تو پیگن زمانے کے فلسفیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا گیا۔

سن پانچ (5) صدی عیسوی میں جب جسٹینن حکمران ہوا تو اس نے ایتھنز میں قائم شدہ افلاطون کی اکیڈمی کو بند کرا دیا۔ یہ اکیڈمی افلاطون کے زمانے سے اس کے بند ہونے تک فلسفے کی تعلیم کے لئے مشہور تھی۔ رومی عہد میں بھی یہاں دور دور سے طلباء حصول فلسفہ کے لئے آتے تھے۔ اس کے بند ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرچ اور مذہبی عقیدہ معاشرے میں مضبوط ہو گیا۔ پیگن فلسفیوں کے خلاف عیسائی راہبوں کی جو مہم چلی اس کا شکار اسکندریہ کی ایک پیگن خاتون ہوئی۔ اسے اس کے گھر سے باہر نکالا گیا، سنگسار کیا گیا۔ اور پھر اس کے جسم کے ٹکڑے کر کے جلایا گیا۔ یہ تنگ نظری اس لئے پیدا ہوئی کہ مذہب کے ماننے والے فلسفے سے گھبراتے تھے اور اس سے ڈر محسوس کرتے تھے کہ فلسفہ ان کے ایمان کو کمزور کر دے گا۔

بلند اقبال

نویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلامی دنیا میں ترقی ہو رہی تھی تو اس وقت یورپ میں رومی سلطنت کا کیا حال تھا اور ان کے ہاں علم و ادب میں کیا تحقیق ہو رہی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی

رومی سلطنت تو 410 عیسوی ختم ہو چکی تھی جرمن قبیلوں نے اس پر حملے کر کے اور

شکست دے کر مغربی یورپ میں اس کا خاتمہ کر دیا تھا مگر بازنطینی سلطنت جو مشرقی رومن ایمپائر کہلاتی تھی اور جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا وہ قائم رہی لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا اس عہد میں چرچ بے انتہاء طاقتور ہو گیا تھا اور اس نے غیر عیسائی فلسفے کے تمام نشانات کو مٹا دیا تھا۔ جس نے یورپ میں علم و ادب کو محدود کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کے برعکس جب اسلامی دنیا میں عباسی برسرِ اقتدار آئے تو 813ء عیسوی میں ہارون الرشید نے بغداد میں دارالحکمت ایک ادارہ قائم کیا۔ جس میں عیسائی، یہودی اور ہندوستانی علماء کو بلایا تا کہ وہ تحقیق اور تفتیش میں حصہ لیں۔ ادارے میں ایک کتب خانے کا قیام عمل میں آیا جس میں مختلف علوم و فنون پر نادر مسودات جمع کئے گئے۔ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے ادارے میں اور زیادہ دلچسپی لی۔ وہ خود علماء کی محفل میں شریک ہوتا تھا اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیتا تھا۔ دارالحکمت میں اس نے ایک رصد گاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ یہاں پر سنسکرت اور یونانی کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے۔ یہ ادارہ 1258ء تک قائم رہا جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو پہلے اس نے قلعہ الموت میں حسن بن صباح کا قائم کردہ کتب خانہ جس میں مختلف موضوعات پر بیش بہا کتابیں تھیں اسے برباد کیا۔ پھر دارالحکمت کے کتب خانے کی کتابیں جلائیں اور مسودات کو دریائے دجلہ میں پھینک دیا۔ مورخ کہتے ہیں کہ مسودات کی سیاہی سے دریا کا پانی کالا ہو گیا تھا۔ کتب خانوں کی یہ تباہی جمع شدہ علم کی تباہی تھی۔ دارالحکمت میں علم ریاضی میں جو تحقیق ہوئی اس میں الخوارزمی کا بڑا حصہ رہا۔ علم ہندسہ میں صفر کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی تھی وہاں سے اسے عربوں نے سیکھا تھا۔ عربوں نے اُندلس میں اسے روشناس کرایا اور وہاں سے یہ یورپ گیا۔ اس لئے آج بھی یورپ میں ایک، دو تین کے اعداد کی تحریک نیمرلز کہتے ہیں۔ جب کہ درحقیقت یہ ہندوستانی تھے۔

بلند اقبال

یونانی زبان سے عربی میں جو تراجم ہوئے ان کی وجہ سے کیا اسلامی معاشرے میں فلسفہ کو فروغ ملا؟

ڈاکٹر مبارک علی

یونانی سے عربی میں تراجم دارالحکمت میں ہوئے اور یہ مترجم انہیں ان فلسفیوں کی وجہ سے ملے کہ جنہیں بازنطینی سلطنت نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔اس لئے یہ عراق کے شہر حزان میں آ کر آباد ہوگئے تھے۔ یونانی فلسفے کی کتابوں نے تعلیم یافتہ عربوں کو ذہنی طور پر متاثر کیا چنانچہ مامون کے زمانے میں معتداللہ نامی تحریک شروع ہوئی جس کے مراکز بصرہ اور بغداد میں تھے۔اس تحریک کے فلسفیوں نے مذہب اور عقیدے پر کئی سوالات اٹھائے۔انہوں نے اخوان الصفا کے نام سے رسائل لکھنا شروع کئے جن میں مذہب کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا۔ لکھنے والوں نے اپنے نام مخفی رکھے کیونکہ معاشرہ ان کے خیالات برداشت کرنے پر تیار نہ تھا۔ اب ان رسائل کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے جس سے اِس عہد کے فلسفیانہ خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

مامون کے عہد میں انہیں کے خیالات سے متاثر ہوکر خلقِ قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یعنی دوسری مخلوقات کی طرح قرآن بھی خلق ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح دوسری مخلوق وقت کے ساتھ زوال پذیر ہو جاتی ہے۔قرآن کو بھی اس عمل سے گزرنا ہوگا۔اس پر علماء کی جانب سے سخت مزاحمت ہوئی اور امام حنبلؒ کو قید میں رکھا گیا اور کوڑے بھی مارے گئے۔ مامون کی وفات کے بعد اس مسئلے کا خاتمہ ہوا۔

فلسفے کو برداشت نہ کرنے کا واقعہ اسحاق ابن کندی کا ہے۔ ہارون الرشید نے ان کی سرپرستی کی تھی مامون کے زمانے میں بھی ان کی سرپرستی جاری رہی مگر اس کی وفات کے بعد جب المتوکل خلیفہ ہوا تو اس نے کندی کے آزادانہ خیالات کی وجہ سے ان پر سختی کی اور ان کا کتب خانہ ضبط کرلیا گیا۔اگرچہ بعد میں اسے واپس بھی کر دیا گیا لیکن معتزلہ کی یہ تحریک خاموشی کے ساتھ ختم ہوگئی۔اور اسلامی معاشرے کو ذہنی طور پر تبدیل نہ کر سکے۔

معتزلہ کے زوال کے بعد ہم اسلامی دنیا میں چند اہم شخصیتوں کو دیکھتے ہیں کہ جنہوں نے یونانی تراجم کے زیر اثر فلسفے میں دلچسپی لی ان میں سے ایک ابوبکر رازی ہیں۔ یہ پیشے کے

اعتبار سے حکیم تھے، لیکن اپنے عہد کے دوسرے علوم میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ مذہب اور عقیدے پر تنقید کی ہے۔ دوسرے اہم فلسفی فارابی تھے انہوں نے ارسطو کے فلسفے کی تشریح اور تفصیل پیش کی ہے لیکن جہاں ارسطو کا فلسفہ عقیدے پر تنقید کرتا ہے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انہیں معلمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تشریحات کی وجہ سے ارسطو کے فلسفے کو اسی طرح سے اسلامی معاشرے میں مقبولیت ملی جیسا کہ یورپ میں چرچ نے اس کے فلسفے کو عیسائیت میں ڈھال کر استعمال کیا تھا۔

یونانی فلسفہ بھی ترجموں کی شکل میں پوری طرح سے نہیں آیا مثلاً سقراط' افلاطون' اپی کیوریس' کلبیت اور رواقی فلسفے کے بارے میں معلومات نہیں ملتی ہیں۔ ارسطو کو اس لئے قبول کیا گیا کہ اس سے عقیدے کو تقویت ملے۔

نویں صدی عیسوی میں ہمیں ابن سینا کا ذکر ملتا ہے جو تھے تو طبیب مگر فلسفے اور دوسرے علوم میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔ ان کی دو کتابیں الشفاء اور القانون اپنے بنیادی خیالات کی وجہ سے مشہور ہوئیں اور لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر یورپ کی جامعات میں پڑھائی جانے لگیں۔ لیکن ان تمام لوگوں کو فلسفی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ عقیدے سے انحراف نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ متکلمین تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں فلسفے کی بنیادیں کمزور رہیں۔

اب میں یہاں پر خاص طور پر ابوریحان البیرونی کا ذکر کرنا چاہوں گا جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا یہاں رہ کر سنسکرت سیکھی اور ہندوستانی فلسفے، مذہب اور رسم و رواج کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اس کی کتاب الہند آج بھی ہندو فلسفے اور مذہب پر اتھارٹی ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں اس عہد کے مسلمان رہنما دوسری اقوام کے فلسفے اور مذہب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب نئے ملک فتح ہوتے تو مسلمان حکمرانوں کو ان پر حکومت کرنے کے لئے چاہیے تھا کہ وہ ان کی تاریخ، فلسفہ اور عقائد کے بارے میں سیکھیں چنانچہ اس کی وجہ سے علم میں اضافہ ہوا لیکن دیکھا جائے تو کوئی بنیادی فلسفہ تخلیق نہیں ہوا

جیسا کہ ہم یونان میں دیکھتے ہیں۔

بلند اقبال

بارھویں صدی میں امام غزالیؒ کا فلسفے پر کیا اثر ہوا؟

ڈاکٹر مبارک علی

امام غزالی کی شخصیت اور ان کی فکر نے مذہب اور فلسفے دونوں کے بے انتہا متاثر کیا امام غزالی کا وہ عہد ہے کہ جب سلجوقی خاندان حکمران تھے اور عباسی خلیفہ ان کی نگرانی میں تھا دوسری جانب مصر میں اسماعیلیوں کی فاطمی خلافت قائم ہو چکی تھی انہوں نے 913 عیسوی میں جامعہ الاظہر کی بنیاد رکھی تا کہ اسماعیلی فرقے کی تبلیغ کے لئے مبلغین کو تیار کیا جائے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے نظام الملک توسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی جس کے صدر مدرس امام غزالی تھے۔ چونکہ ان کا تعلق اشعری فرقے سے تھا جو مذہبی معاملات میں بے انتہا راسخ العقیدہ تھا۔ لہٰذا امام غزالی کی فکر اور ان کے مذہبی خیالات اس عہد سے متاثر ہوئے اول انہوں نے اسلام میں مزید فرقہ وارانہ تصادم اور مذہب کی نئی تفسیر و تاویل کو روکا اور یہ دلیل دی کہ اب اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام میں ہر چیز مکمل ہو چکی ہے۔ اگر اس میں نئے مذہبی خیالات آئے تو ان کی وجہ سے جھگڑے اور فسادات ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے اجتہاد کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

لہٰذا امام غزالی نے اسلامی معاشرے میں فلسفیانہ خیالات کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فلسفہ عقائد کو چیلنج کر کے شک و شبہ پیدا کرے گا۔ اس لئے فلسفے کو رد کرنا اور اس کے غلبے سے مذہب کو محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ''تہامتہ الفلسفہ'' نامی کتاب لکھی جس میں اس کی مذمت کرتے ہوئے اس کے مضر اثرات پر بحث کی ہے۔

بلند اقبال

کیا امام غزالی کی تعلیمات نے فلسفے کو ختم کر دیا؟

ڈاکٹر مبارک علی

جی ہاں یہ ضرور ہوا کہ غزالی کی تعلیمات کے سلجوقی سلطنت اور عباسی خلافت کے مشرقی حصے پر تو ضرور ہوا۔ مگر اُندلس میں جہاں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی ان کا ماحول مختلف تھا یہاں عیسائی یہودی اور مسلمان مل جل کر رہ رہے تھے۔ اور فکر کی آزادی تھی لہٰذا اس ماحول میں ابنِ رُشد نے جو قرطبہ کا رہنے والا تھا اپنے فلسفیانہ خیالات شائع کئے۔ اس کے یہ خیالات مذہب کو چیلنج کرتے تھے اور ان سے عقیدے پر کاری ضرب لگتی تھی۔ کیونکہ وہ روح کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ اس نے غزالی کی کتاب ''تہامتہ الفلسفہ'' کا جواب بھی لکھا تھا۔ اگرچہ اس کی کتابیں یورپ کی جامعات میں پڑھائی جاتی تھیں مگر اُندلس کے مذہبی حلقوں نے اس کی مخالفت کی۔ اور اسے جلاوطن کر دیا گیا زندگی کا بقیہ حصہ اس نے مراکش میں گزارا۔

امام غزالی اور ابنِ رُشد کے درمیان مذہبی عقائد اور فلسفیانہ افکار کے درمیان تصادم تھا۔ اس تصادم میں غزالی کامیاب رہے اور ابنِ رُشد ناکام۔ یہ وہ روایت ہے جو آج بھی اسلامی معاشرے میں جاری رہے۔

بلند اقبال

کیا فلسفے کے ختم ہونے کے بعد اسلامی معاشرے میں صوفیانہ خیالات کو فروغ ملا۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا یہ سوال بہت اچھا ہے کہ اگرچہ صوفیانہ تحریکیں اسلامی معاشرے میں پہلے سے موجود تھیں۔ مگر جب فلسفیانہ افکار کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تو صوفیاء نے اس خلاء کو پُر کیا

صوفیانہ تحریکیوں پر ابنِ عربی کے گہرے اثرات ہیں۔ جنہوں نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا جس کی وجہ سے معاشرے میں مذہبی رواداری کے جذبات پیدا ہوئے اور دوسرے مذاہب کو برداشت کیا جانے لگا۔ اس لئے یہ نظریہ حکمرانوں کے لیے بھی ضروری ٹھہرا کیونکہ اس صورت میں مذہبی فرقوں میں بٹی رعایا امن و امان کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیاء کے مختلف سلسلے اسلامی معاشرے میں مقبول ہوئے ان میں سے اکثر کا تعلق وسطِ ایشیا سے تھا جیسے چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ سمرقند، قادریہ کا تعلق عراق کے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے تھا، صوفیاء کرام کی خانقاہیں اور ان کے مزارات لوگوں کی زیارت کا مرکز بن گئے، صوفیانہ تحریکیوں کا اہم اثر یہ تھا کہ یہ مذہبی انتہاء پسندی کے خلاف تھیں۔ اور شرعی پابندیوں سے بھی احتراز کرتی تھیں۔ لیکن فلسفے اور صوفیانہ خیالات میں فرق رہا کیونکہ فلسفے کے برعکس صوفیاء کے ہاں عبادت، ذکر اور مراقبے کے ذریعے روحانی سکون حاصل کرنا ہے۔ ان کے ہاں ذہنی شعور کو پختہ کرنے کی کوئی جگہ نہیں۔

بلند اقبال

کیا مناسب نہیں ہوگا کہ یہاں ہم ابنِ خلدون کا ذکر کریں؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے اچھا کیا کہ ابنِ خلدون کے بارے میں بھی ذکر کیا کیونکہ وہ فلسفۂ تاریخ کے اہم مفکرین میں سے ایک ہیں۔ ایک مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی سیاست میں بھی حصہ لیا اور آخر میں ایک قلعے میں قیدی کی زندگی گزاری اس قید کی حالت میں اس نے تاریخ کا مقدمہ لکھا۔ اپنے وقت میں یہ بحیثیت مورخ کے مشہور ہو چکا تھا جب امیر تیمور نے دمشق کا محاصرہ کیا تھا اس نے ابنِ خلدون سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اس کو قلعے کی فصیل سے اتار کر تیمور کے خیمے میں پہنچایا گیا۔ یہاں تیمور نے اس سے تاریخ کے بارے میں سوالات کئے اور پھر عزت و احترام سے اُسے رخصت کیا۔

''مقدمہ'' میں ابنِ خلدون نے فلسفۂ تاریخ کو پیش کیا ہے۔ مثلاً تاریخ کا یہ ایک اہم سوال رہا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال کیوں ہوتا ہے۔ ابنِ خلدون نے اپنے تجربات، مشاہدات اور سوچ کی بنیاد پر اس کے بارے میں کہا کہ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ بچپن گزارتا ہے، جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں گزار کر مر جاتا ہے یہی صورت تہذیبوں کی ہوتی ہے۔ جو پیدائش کے بعد جوانی تک اپنی توانائی اور صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان کی توانائیاں زوال پذیر ہو کر خستہ ہو جاتی ہیں۔ اور وہ موت سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔ شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ شاہی خاندان چار نسلوں کے بعد کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق پہلی نسل بانیوں کی ہوتی ہے دوسری نسل میں سلطنت وسیع ہو کر مستحکم ہوتی ہے۔ تیسری نسل محض تقلید کرتی ہے۔ اور چوتھی نسل اس سے آگے مقلدوں کی ہوتی ہے۔ جو سلطنت میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کرتی ہیں۔ اور ان کی حکومتیں پرانی اور فرسودہ روایات پر چلتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی بیرونی حملہ آور یا اندرونی سازش شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

ابنِ خلدون کے مقدمے کو اسلامی معاشرے نے نظر انداز کر کے فراموش کر دیا تھا۔ یہ کوئی انیسویں صدی کی بات ہے کہ جب عثمانی سلطنت رُو بہ زوال تھی تو اس موقع پر اس کے کچھ دانشوروں نے کہا ابنِ خلدون ''مقدمہ'' سے قوموں کے عروج و زوال کے مسئلے کو سمجھا جائے۔ چونچہ ترکی میں یہ مقدمہ دریافت ہوا اور اس کے بعد یہ یورپ کے ملکوں میں پہنچا جہاں مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اور فلسفۂ تاریخ میں اسے اہمیت دی گئی۔

ابنِ خلدون نے تہذیبوں اور شاہی خاندانوں کے بارے میں رائے دی ہے۔ اس کی بنیاد اس کے عہد کے قبائل اور شاہی خاندانوں کی حکومتیں تھیں۔ لیکن اس کمی کے باوجود اس نے تاریخ کے عمل کو گہرائی سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

بلند اقبال

موجودہ زمانے میں اسلامی دنیا میں کیا صوفیا کا کردار بھی ختم ہو گیا اور کیا فلسفے نے

معاشرے کو کسی بھی طرح سے متاثر نہیں کیا؟

ڈاکٹر مبارک علی

تصوف بھی ایک خاص وقت اور حالات کی پیداوار تھا۔ جب حالات اور وقت میں تبدیلی آئی تو تصوف کی افادیت بھی ختم ہوگئی۔ اب دوبارہ سے تصوف کا احیاء ممکن نہیں اس کی پرچھائیاں ضرور ہیں مگر اس کا حقیقی کردار ختم ہو چکا ہے۔

اور یہی کچھ حال فلسفے کا ہے مذہب اور عقیدے کے تسلط میں متکلم تو پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر فلسفی نہیں، یہ ہماری کم مائیگی ہے کہ ہم نے اقبال کو بھی فلسفی بنا دیا ہے۔ اوّل تو کوئی شاعر فلسفی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فلسفے کو نثر میں لکھا جا سکتا ہے۔ شاعری میں نہیں، اقبال کے فلسفی کے ہونے کا انکار کرتے ہوئے علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب ''اقبال اور اس کا علمِ کلام'' میں انہیں متکلم کہا ہے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی فلسفی نہیں۔ مدرسوں کے نصاب میں فلسفے کو شامل نہیں کیا جاتا۔ 1866ء میں جب دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا تو اس کے نصاب سے فلسفہ خارج تھا۔ اب ہماری جامعات میں یورپی فلسفہ پڑھایا جاتا ہے۔ مگر اس تعلیم نے مقلد تو پیدا کیے مگر فلسفی نہیں۔ لہٰذا ہمارے ہاں یا تو شاعر ہیں یا علماء لیکن فلسفی نہیں۔ کیونکہ ان دونوں کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اس لئے لوگوں میں اشتعال انگیزی اور احساسات کی انتہا پسندی ہے۔ فلسفہ جو مسائل کو عقل و دلیل اور ٹھنڈے مزاج کے ساتھ سوچتا ہے یا تجزیہ کرتا ہے اور ذہن کی پختگی کرتا ہے۔ اس سے ہم محروم ہیں۔

بلند اقبال

حالات اگرچہ مایوس کن ہیں لیکن پھر بھی کوئی امید کی کرن ہے کہ فلسفہ ہماری سوسائٹی میں کوئی کردار ادا کر سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی

جہاں تک اسلامی دنیا اور پاکستان کی بات ہے ہمیں یہاں فلسفے کے پیدا ہونے یا فلسفیانہ خیالات وافکار کے مواقع بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں اوّل تو عام مسلم ممالک ہیں یا تو بادشاہتیں ہیں یا آمرانہ حکومتیں اور یا نام نہاد جمہوریتیں۔ ان میں ایک ایسا سیاسی نظام ہے کہ جس میں تنقید کرنا، فرسودہ روایات کو چیلنج کرنا، بغاوت اور غداری کہلاتا ہے۔ دوسرے عقیدے کا تسلط، جس کی وجہ سے آزادانہ خیالات پر پابندی عائد ہے۔ اور پاکستان میں تو نظریاتی دیواریں بھی ہیں۔ لہٰذا فلسفہ اس وقت پنپ سکتا ہے۔ جب اسے آزاد ماحول ملے۔ کیونکہ اس ماحول میں متبادل نظام پیش کرنے والا اور نئے خیالات وافکار کی تبلیغ کرنے والا معاشرہ دشمن ٹھہرتا ہے اور جیسا کہ اکثریت کی آمریت ہے۔ ایسے فرد کو وہ زندہ رہنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اس لیے موجودہ دور میں یا مستقبل میں ہمیں فلسفیانہ تحریکوں کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

بلند اقبال

میں نے پاکستان میں جو تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مغرب اور کینیڈا میں جو دیکھا تو اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد رٹا لگانا۔ اہم باتوں کو حفظ کر لینا اور پھر اس طرح سے امتحان میں نقل کر ڈالنا ہے جب کہ مغرب میں تعلیم کا مقصد ذہن کو تجرباتی عمل سے گزارنا ہوتا ہے۔ ہر چیز کی تہہ تک پہنچنا، غور وفکر کرنا اور پھر اپنی رائے دینا۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے سہی کہا ہماری تعلیم تنقیدی اور تجرباتی ذہن کو پیدا نہیں کرتی ہے۔ اس وقت مغرب ملکوں یا امریکہ میں تحقیق ہوتی ہے۔ ہم اس پر غور وفکر کیے بغیر ایمان لے آتے ہیں۔ ہماری اپنی کوئی تخلیقی صلاحیتیں نہیں کہ ہم نئی فکر کو پیدا کر سکیں۔ موجودہ دور میں سائنس اور

ٹیکنالوجی کی ترقی تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اسی تیزی کے ساتھ ہماری سوچ کو بھی بڑھنا چاہیے۔ چونکہ یہ نہیں ہو رہا اس لئے فلسفہ سائنس اور ٹیکنالوجی آگے کی جانب چلی گئی اور ہم پسماندگی کی حالت میں ہیں۔ اگر یہ صورتحال رہی تو مستقبل میں ہماری پسماندگی میں اور اضافہ ہوگا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ۔ اگرچہ حالات مایوس کن ہیں مگر ہم یہ اُمید رکھیں کہ شاید بیرونی اور اندرونی دباؤ کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ تبدیل ہو جائے ان پروگراموں کے ذریعے بھی ہماری خواہش تو یہی ہے کہ لوگ بحث و مباحثہ کریں اور زمانے کے تقاضوں کے تحت اپنی فرسودگی چھوڑ کر مستقبل کو بہتر بنائیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک باہر پھر آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔

☆.....☆.....☆

8- تاریخ کے فائدے اور نقصانات

بلند اقبال

آج ہم جس اہم موضوع پر بات کرنے جا رہے ہیں وہ تاریخ کا مضمون ہے۔ ہم اکثر اپنی گفتگو میں تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے ان جملوں کا استعمال کرتے ہیں جیسے تاریخ کے پس منظر میں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور اکثر اپنے رہنماؤں کو مشورہ دیتے ہیں کہ تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ تاریخ کا موضوع اپنی وسعت میں سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس لیے معاشرے اپنی روایات کو تاریخ کے حوالے سے جائز قرار دیتے ہیں اور حکمران اپنے مفادات کو تاریخ کی روشنی میں درست ثابت کرتے ہیں اور کبھی تاریخ کی مدد سے ایسے افراد کو ہیرو بنا دیا جاتا ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔ ریاستیں بھی اپنی خونریزی اور جبر کو تاریخی حوالوں سے صحیح ثابت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے اس میں ردّو بدل کیا جاتا ہے اور اس کو حکمران طبقے اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہم آج اس اہم موضوع پر کہ تاریخ کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں؟ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ جنہوں نے تاریخ کے موضوع پر اسّی (80) کے قریب کتابیں لکھ کر تاریخ کو پاکستان میں ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تاریخ کے فائدے اور نقصان پر جاؤں۔ سب سے پہلے یہ بنیادی سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا پاکستان کا وجود میں آنا کوئی حادثہ تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے جو برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے کو حادثاتی کہا ہے اس کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ شاید اس سے پہلے اس موضوع پر کھُل کر بات نہیں ہوتی تھی۔ جن مورخوں نے پاکستان کی ابتدائی تاریخ لکھی انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان کا بننا ناگزیر تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد ان ساٹھ پینسٹھ سالوں میں پاکستانی تاریخ آگے بڑھی تو یہ ترقی کی بجائے پس ماندہ ہوتی چلی گئی۔ جمہوریت کا فروغ نہیں ہوسکا۔ آمرانہ فوجی حکومتیں اقتدار میں رہیں، جاگیرداری کا نظام مضبوط رہا، صنعتی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے ہم معاشی طور پر ابتری کا شکار رہے۔ ہندوستان سے جنگوں کی وجہ سے خوشگوار تعلقات قائم نہ ہوسکے۔ بنگلہ دیش آزاد ہوا۔ بیرونی قرضوں نے معیشت کو نقصان پہنچایا، تعلیمی ادارے نااہلی کا شکار ہوئے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے نفرتوں کو جنم دیا، مذہبی انتہا پسندی نے ذہنوں کو آلودہ کیا۔ ان حالات میں لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ تقسیم صحیح تھی یا غلط؟ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ مسلم لیگ، کانگرس یا برطانوی حکومت؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ماضی میں کون کون سی غلطیاں سرزد ہوئیں، غلط فیصلے ہوئے اور اس مرحلے میں اپنی غلطیوں کے اعتراف کے بعد پاکستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کی تشکیل نو کرنا چاہیے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ذرا یہ بتایئے کہ پاکستان میں تاریخ کے مضمون کو کیسے لکھا اور پڑھا جا رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کے فوراً بعد مورخوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ

وہ تاریخ کے حوالے سے ریاست کے وجود کو ثابت کریں اس سلسلے میں سب سے زیادہ موردِ الزام آئی ایچ قریشی کو ٹھہراتا ہوں جو کہ پاکستانی ریاست کے نظریہ ساز ہو گئے تھے۔انہوں نے دو قومی نظریے کو تاریخی حوالوں سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب (Muslim Communit in Indian Subcontinent) یعنی ''برصغیر ہندوستان میں مسلم معاشرہ'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو بھی مسلمان وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور عرب ملکوں سے آتے تھے وہ ہندوستان میں آ کر اپنی وطنی شناخت کو ختم کر دیتے تھے اور مسلم معاشرے میں خود کو ضم کر دیتے تھے۔ حالانکہ تاریخی طور پر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ باہر سے آنے والے مسلمان خود کو ایرانی یا طورانی، افغانی، بخاری، مغل اور سمرقندی کہلاتے رہے ہیں بلکہ ہندوستان کے وہ لوگ جو تبدیلی مذہب کے بعد مسلمان ہوئے تھے، ان میں اور بیرونی مسلمانوں میں تعصب اور فرق رہا۔ مسلم کمیونٹی اور ہندو کمیونٹی کی یہ اصطلاحات برطانوی دورِ حکومت میں استعمال ہونا شروع ہوئیں۔ آئی۔ ایچ۔ قریشی اکبر کے بھی خلاف تھے، اور اسے مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اکبر جس نے مغل سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کیا، اس کو وسعت دی، اس کے قوانین بنائے، اس کو محض اس لیے قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے کیونکہ اس نے ہندوؤں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے اسے ہندوستانی روایات میں ڈھالا۔ وہ اکبر کے مقابلے میں احمد سرہندی کو بطور ہیرو سامنے لاتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کی اور یوں وہ دو قومی نظریے کو ان سے جا ملاتے ہیں۔ وہ تاریخ میں علماء کے کردار کے بھی حامی ہیں۔ آئی ایچ قریشی کی ان روایات کو معین الحق اور احسن اکرام نے آگے بڑھایا۔ آگے چل کر ڈاکٹر وانی نے پاکستان کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی۔ ایوب خان نے ایک مرتبہ پاکستان کے مورخین کو بلا کر ان سے کہا تھا کہ آپ پاکستان کی تاریخ لکھیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا پاکستان کی تاریخ میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کو شامل کیا جائے یا نہیں؟ فیصلہ تو مورخوں کو کرنا تھا مگر ڈاکٹر وانی نے ایوب خان سے کہا کہ جیسا آپ کہیں گے ہم ویسی ہی تاریخ لکھیں گے۔

یہ بات انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہی۔ اس پر میرا ریمارک یہی تھا کہ یہ کام قدیم عہد کے مورخ کرتے تھے۔ جو بادشاہوں کی مرضی کی تاریخ لکھتے تھے۔ ڈاکٹر وانی نے یہ دلیل بھی دی کہ پاکستان کو اپنا واسط وسط ایشا سے جوڑنا چاہیے۔ کیونکہ ثقافتی طور پر ہم ان کے قریب ہیں۔ تاریخ کی یہ مسخ شدہ شکل ہمارے نصاب کی کتابوں میں بھی آ گئی ہے۔ اور اب نوجوان اسی تاریخ کے حوالے سے پاکستان کو دیکھتے ہیں۔

بلند اقبال

تاریخ کو مسخ کرنے کا سلسلہ ہم مغرب میں بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ملک پر حملہ کرنا ہو تو تاریخی حوالوں سے ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ امن کے لئے خطرہ ہے۔ جیسا کہ ہم عراق کی جنگ میں امریکی اور برطانوی کردار کو دیکھتے ہیں۔ تو کیا یہی سب کچھ پاکستان کی تاریخ نویسی میں نہیں ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا کہنا درست ہے یورپ اور امریکہ میں بھی ریاستی اور طبقاتی مفادات کے تحت تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ مثلاً نسل پرستی اور قوم پرستی کے نظریات کی روشنی میں یورپ نے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر اپنی بالادستی کو جائز قرار دیا ہے اور دلیل یہ دی کہ کیونکہ ہم نسلی اعتبار سے اعلیٰ اور افضل ہیں، مُہذب ہیں، ترقی یافتہ ہیں، اس لئے ہمارا یہ حق ہے کہ تم پر، جو غیر مہذب اور پسماندہ ہو، حکومت کریں اور تمہیں پسماندگی سے نکال کر ترقی کی جانب لے جائیں یورپ کی ترقی کی دلیل دیتے ہوئے ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس کی ترقی میں ایشیا اور افریقہ کا کوئی حصہ نہیں یہ اس کی اپنی اندرونی توانائی کے نتیجے میں ہوئی ہے۔

ہماری اور یورپ اور امریکہ کی تاریخ نویسی میں فرق یہ ہے کہ ان کی نسلی اور قوم پرستانہ تاریخ کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ایک متبادل تاریخ لکھی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ کو کئی زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں اس

ریاستی اور نظریاتی تاریخ کو نہ تو چیلنج کیا جاتا ہے اور نہ کوئی متبادل تاریخ لکھی جاتی ہے۔ ہاں اگر ایک آدھ مورخ یہ کوشش کرتا ہے تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یا اُسے ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہماری تاریخ کا ایک ہی نقطہ نظر غالب رہتا ہے جسے نصابی کتابوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مشتہر کیا جاتا ہے۔

بلند اقبال

کیا جنرل ازم بھی تاریخ کو مسخ کرتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

جنرل ازم تاریخ کو دو طرح سے مسخ کرتا ہے ایک تو حالیہ واقعات جو شائع ہوتے ہیں، ان کی صحت پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ تحقیقاتی رپورٹس یا نیوز کے نام پر نمائندہ واقعے کو مسخ کر کے پیش کرتا ہے اور یہ مواد آنے والے مورخوں کے لئے ماخذ کا کام دیتا ہے۔ اس کی مثال اُردو کے اخبار ''نوائے وقت'' سے دی جاسکتی ہے۔ جو ہندوستان کا سخت مخالف ہے۔ اور پاکستانی ریاست کا نظریاتی حامی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اس کی خبروں پر انحصار کرے گا۔ یہ تعصّبات اس کی تحریروں میں آجائیں گے جیسے زاہد چوہدری جنہوں نے پاکستان کی تاریخ لکھی ہے ان کا بنیادی ماخذ نوائے وقت ہے۔ دوسرے اُردو اخبار بھی اسی رویے کا شکار ہیں۔

دوسرے اُردو اخباروں میں تاریخ پر جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں بھی تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال تو قائداعظم کی دی جاسکتی ہے۔ جنہیں اُردو اخبار کے مضامین میں مذہبی اور تہجد گزار بنا کر پیش کیا جارہا ہے اور اس قسم کے واقعات بھی لکھے جارہے ہیں کہ ایک مرتبہ حسرت موہانی جب ان سے ملنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم اپنے کمرے میں مصلّے پر بیٹھے زاروقطار رو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ قائداعظم کی شخصیت اس کے برعکس تھی۔

بلند اقبال

کیا تاریخی ناول نگار بھی تاریخ کو مسخ کرتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

جی بالکل کرتے ہیں۔ چونکہ ناول نگاری اور شہادتوں کی بنیاد پر لکھی جانے والی تاریخ جدا جدا ہیں۔ یورپ میں بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تاریخی ناول نگاری بہت مشہور ہوئی تھی کیونکہ اس میں فوجی مہم جوؤں یا نائٹوں کی رومان پرور داستانیں ہیں۔ جو اس وقت کے اہل یورپ کو ماضی میں لے جا کر رومانوی خیالات سے مسحور کر دیتے تھے۔ اردو میں یہ ناول نگاری عبدالحلیم شرر سے شروع ہوئی۔ جو برطانوی دور کے مسلمانوں کے لئے ایک شاندار ماضی پیش کرتی تھی جس میں مسلمان عیسائیوں پر فتح پا رہے تھے اور مسلمان ہیروز اپنی شجاعت اور بہادری سے دنیا کو حیران کر رہے تھے۔ اس ناول نگاری میں مسلمان ہیرو اور عیسائی دوشیزہ کا ہونا بھی ضروری تھا۔ یہ ناول اپنے وقت میں بہت مشہور ہوئے اور پھر ان کی طرز پر صادق حسین صدیقی اور دوسرے ناول نگاروں نے اسلامی تاریخ پر بے شمار ناول لکھے۔ لیکن اس ماڈل سے ہٹ کر جب نسیم حجازی نے اسلامی ناول لکھے تو ان کی بہت زیادہ مقبولیت ہوئی اور آج تک ہے۔ کیونکہ یہ ناول ایک پسماندہ معاشرے میں رہنے والوں کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں اس کے ہیروز بہادری سے لڑ رہے ہیں اور دشمنوں کو شکست دے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ناول تاریخی کہلاتے ہیں اور ان میں تاریخی واقعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ناول نگار اور مورخ میں فرق ہوتا ہے۔ مورخ جب بھی کوئی واقع لکھتا ہے اسے ایک شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناول نگار اس سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی خود تشکیل کرتا ہے اور جس طرح چاہے اسے اپنے ناول کے ماحول میں ڈھال دیتا ہے۔ تاریخی ناولوں کی اس دلچسپی کی وجہ سے ایسے بہت سے تاریخی کردار سامنے آتے ہیں جن کا سرے سے تاریخ میں ذکر نہیں یا پھر انہیں ناول نگار نے تاریخ کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس کی ایک مثال انارکلی کی ہے۔ جس پر ڈرامے لکھے

گئے اور فلمیں بنائی گئیں حالانکہ تاریخ میں ایسا کوئی کردار نہیں ہے۔ اور اب ڈائجسٹوں میں قسط وار نوبل تاریخی افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کی تاریخ فہمی کی بنیاد یہی ناول، افسانے اور ڈرامے ہیں۔ مستند تاریخ کی غیر موجودگی میں یہی لوگوں کا تاریخی شعور بنا رہی ہیں۔

بلند اقبال

کیا شخصیات کو مقدس بنانے کے لئے ان کے خلاف تاریخی مواد کو ضائع کر دیا جاتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا کہنا صحیح ہے کہ مذہبی سماجی اور سیاسی شخصیات کو مقدس بنانے کی خاطر ان کے خلاف مواد کو ضائع کر دیا جاتا ہے یا قانون طور پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے کہ ان پہ کوئی تنقید نہ کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حکمران طبقے ان کے نام پر ان کے نظریات کی بنیاد پر اپنے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔

یہاں پر میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ تاریخ کو مسخ کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً جو مورخ حکمران طبقوں کے خلاف ہیں ان کی تحریروں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ ان پر سنسرشپ لگا دی جائے اور کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگا دی جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سرکاری دستاویزات سے ان کے نام کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ روس میں اسٹالن کے زمانے میں (Trotisky) کے نام کو ہر جگہ سے نکال دیا تھا یہاں تک کہ اس کی جو تصاویر روس کے انقلابی راہنماؤں کے ساتھ تھیں وہاں سے اس کی تصویروں کو بھی غائب کر دیا گیا جب کہ تاریخ کو ایک مرتبہ مسخ کر دیا جاتا ہے تو دوبارہ سے اس کی تصحیح کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔

بلند اقبال

پاکستان میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان میں مطالعۂ تاریخ میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ اس کے ابتدائی دور میں جو تاریخ پڑھائی جاتی تھی اس میں قدیم ہندوستان کی تاریخ شامل تھی۔ لیکن جیسے جیسے ملک نظریاتی ہوتا چلا گیا ہم نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کو نصاب سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ عربوں کی فتح سندھ کے راستے ہم نے اپنی تاریخ کے سلسلے کو اسلامی تاریخ سے ملا دیا۔ جبکہ ضروری یہ تھا کہ ہمارا تاریخی سلسلہ قدیم ہندوستان کی تاریخ سے مل کر جاری رہتا۔ اس کے علاوہ برطانوی دور میں جیمس مِل نے جب برطانوی ہند کی تاریخ لکھی تو اس نے تاریخ کو مذہبی ادوار میں تقسیم کر دیا جیسے ہندو دورِ حکومت، مسلم دورِ حکومت اور برطانوی دورِ حکومت ہندوستان کے مورخوں نے اسے چیلنج کیا ہے۔ قدیم ہندوستان کے دور میں تمام حکمران ہندو نہیں تھے۔ ان میں جین اور بدھ مذاہب کے ماننے والے بھی تھی۔ مسلمان دور حکومت میں بہت ساری ہندو ریاستیں تھیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کو مذہب کے ساتھ ملا کر دیکھنے کا سلسلہ انگریزی عہد میں شروع ہوا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اس کے علاوہ آپ پاکستانی تاریخ میں کیا کمزوریاں دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

ہماری تاریخ کی ایک انتہائی کمزوری یہ ہے کہ ہم حملہ آوروں کی تعریف کرتے ہیں، جیسے محمد بن قاسم، محمود غزنوی، اور محمد غوری جبکہ اصولاً ہمیں ہر حملہ آور پر تنقید کرنی چاہیے۔ کیونکہ حملہ آور ہمیشہ دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے لوٹ مار کرتے ہیں۔ دوسرے تاریخ میں یہ روز کا

کردار رہا ہے۔ وہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ تاریخ کی تشکیل میں سیاسی، سماجی اور معاشی قوتیں ہوتی ہیں اور عام آدمی ان کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس لئے پاکستان میں جو سیاسی، مذہبی اور فوجی ہیروز بنائے گئے ہیں۔ ان کی جگہ عام لوگوں کو دینی چاہیے جس میں کسان، مزدور اور کاری گر شامل ہیں۔ جو اپنی محنت مشقت سے تاریخ بناتے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ کہاں تک صحیح ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

اگر چہ یہ مقولہ مقبولِ عام ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور ایک جیسے واقعات بار بار ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ انسانی فطرت ایک جیسی رہتی ہے اور تبدیل نہیں ہوتی ہے۔ لیکن تاریخ میں ایک جیسے واقعات بار بار نہیں ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت بھی بار بار بدلتی رہتی ہے۔ کیونکہ تاریخ چار طریقوں سے حرکت کرتی ہے۔ نمبر ایک پہیہ (Wheel) جس کا مطلب ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ دوسری علامت تیر کی ہے یعنی تاریخ سیدھی حرکت کرتی ہے۔ بغیر رکاوٹ کے، تیسرا Pandolum کی طرح دائیں بائیں حرکت اور چوتھا سیسہ ہے جو قوموں کے عروج و زوال کو ظاہر کرتا ہے۔

بلند اقبال

کیا پاکستان میں یورپ، امریکہ، مشرقِ وسطی، وسطِ ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیاء کے بارے میں بھی کچھ پڑھایا جاتا ہے اور کیا تاریخ میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان سے بھی طلبہ کو روشناس کرایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اگر چہ ہمارے نصاب میں ان ملکوں کی تاریخ کو بطور آپشن (Option) لیا جاسکتا ہے لیکن ہمارے ملک کی کسی بھی یونیورسٹی میں ان ملکوں کی تاریخ پر کوئی تحقیق نہیں ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ پر تحقیق بغیر عربی زبان جاننے کے نہیں ہوسکتی اور ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کے لئے فارسی زبان کا جاننا لازمی ہے۔ لہٰذا ہم تاریخ کو ثانوی ماخذ کی مدد سے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی تاریخ ہمارے نصاب کا حصہ ہے۔ امتحان میں گھسے پٹے اور فرسودہ سوالات آتے ہیں۔ لہٰذا یہ تاریخ ہمارے شعور میں کوئی اضافہ نہیں کرتی ہے۔

اس کے برعکس اب تاریخ بدل گئی ہے۔ سیاسی اور معاشی تاریخ کی جگہ اب سماجی اور جذبات اور احساسات کی تاریخ نے لے لی ہے۔ جیسے روزمرہ کی تاریخ، خوشبو کی تاریخ، خوشامد کی تاریخ اور اشیاء کی تاریخ کیونکہ ان فرنیچر سے لے کر کچن کے پریشر ککر تک کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو دیکھیں گے کہ گھنٹے اور گھڑی کی ایجادوں نے ہمیں کس قدر وقت کا پابند کر دیا ہے۔ اور اس سے ہماری روزمرہ کی زندگی کس قدر تبدیل ہوگئی ہے۔

بلند اقبال

مذہب اور تاریخ کے رشتوں کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

دیکھیں تاریخ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہ حوالہ جات اور شہادتوں کی مدد سے واقعات کو بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو مذہب سے ملا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ کا تنقیدی مطالعہ نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مختلف فرقوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جو مسلمان اپنی تاریخ لکھتے ہیں۔ تو اس میں عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور وہ ثواب کے لئے لکھتے ہیں۔ تیسرے تاریخی شخصیتوں کو مذہبی بنا کر ان کو

مقدس بنا دیا جاتا ہے۔ چوتھا خاندانی تاریخ میں پہلے کے حکمران خاندانوں کو یا تو تاریخ سے غائب کر دیا جاتا ہے یا ان کو بدی اور شر کا مجموعہ بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے عباسی دور میں اُمیہ خاندان کے حکمرانوں پر تنقید کی گئی۔ مثلاً حجاج بن یوسف کا کردار ایک ظالم اور جابر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں اگر مغرب کی یونیورسٹی میں مسلمانوں کی تاریخ پر کام کیا جاتا ہے تو اوّل وہ عربی فارسی ترکی اور اس سے متعلق دوسری زبانیں جانتے ہیں پھر بنیادی ماخذ دوں کی مدد سے تحقیق کرتے ہیں۔ تو ہم ان کی تحقیق کو تعصّبانہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ ہماری اس عملی تنگ نظری کی وجہ سے ہم خود اپنی تاریخ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

بلند اقبال

ذرا ہمیں آپ یہ بھی بتایئے کہ تاریخ نویسی کن کن مراحل سے گزری؟

ڈاکٹر مبارک علی

اسلامی تاریخ میں جب تک بادشاہت نہیں آئی تھی اس وقت تک تاریخ کو وقائع کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ پھر حکمران خاندانوں کی تاریخ ہے جیسے عباسی، مغل، صفوی اور عثمانی ترک وغیرہ۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ ہم سیاسی عروج کی تاریخ پڑھتے ہیں۔ جیسے عباسیوں میں المتوکل تک، مغلوں میں اورنگ زیب تک، صفویوں میں شاہ عباس تک اور عثمانی ترکوں میں سلیمان قانونی تک۔ ہم زوال کی تاریخ نہیں پڑھاتے کہ عباسی خلافت کے زوال نے مسلم دنیا کو اس سیاسی ابتری میں تقسیم کر دیا تھا۔ مغلوں کے زوال نے ہندوستان کو سیاسی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں اس حد تک کمزور کیا کہ اسے پہلے حملہ آوروں نے لوٹا پھر ایسٹ انڈیا کمپنی اس پر غالب آ گئی۔ یہی حال ایران میں صفوی خاندان کے زوال اور ترکوں میں عثمانی سلطنت کے خلاف ہوا۔ زوال کا مطالعہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے معاشرے کی کمزوریوں کا پتہ چلتا ہے اور اس تبدیلی کو دیکھا جا سکتا ہے جو عروج کے وقت سے زوال تک آئی۔

بلند اقبال

یہ کہاں تک درست ہے کہ ہمارے ہاں اساتذہ ایک بار نوٹس تیار کر لیتے ہیں اور اپنی پوری ملازمت کی مدت میں انہی تیار شدہ Notes کی بنیاد پر پڑھاتے رہتے ہیں؟ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں پاکستان پر جو تحقیق ہو رہی ہے اور جو نئے نظریات سامنے آ رہے ہیں تو کیا ہماری تاریخ اس سے متاثر ہوگی۔

ڈاکٹر مبارک علی

جی یہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اب تک کالج اور یونیورسٹی کے لیول تک طالب علم یا تو نوٹس کا سہارا لیتے ہیں یا (Guides) کا جو انہیں امتحانات میں پاس کرانے کی گارنٹی دیتی ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ تاریخ کے مضمون میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس سے ہمارے اساتذہ ناواقف رہتے ہیں۔ میں اس کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا کہ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہر نئے سمسٹر میں نیا کورس بناتا ہے۔ اور طلبہ کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی ماخذوں کا مطالعہ کریں ان سے متعلق یورپی یا مشرقی زبانیں سیکھیں اور پھر سیمینار میں طلبہ اپنے تحقیقی مضامین پیش کرتے ہیں جن پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ اس لئے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جہاں جنوبی ایشیا کے شعبے ہیں اور وہاں پاکستان پر جو تحقیق ہو رہی ہے۔ ہمارے اساتذہ اور طالب علم اس سے بہت دور ہیں اور ان کی تحقیقات کا اثر بھی بہت کم ہے۔

جہاں تک تاریخ کے اساتذہ کا تعلق ہے پاکستان کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے تو موجود ہیں مگر تحقیق کرنے والے نہیں، اسی وجہ سے پاکستان میں تاریخ کا کوئی نیا مکتبہ فکر قائم نہیں ہو سکا۔ جو تاریخ کو نئے انداز سے پیش کر سکے۔ اس لئے ضروری تو یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے۔ جو نئے ماخذ سامنے آ رہے ہیں ان کو استعمال کیا جائے۔ مگر جدید تاریخ لکھنے کی بجائے ہمارے ہاں آپ بیتی یا یادداشتوں کا سلسلہ جاری ہے اور یہ لکھنے

والے کون ہیں۔ ریٹائرڈ سرکاری عہدیدار یا آرمی کے جنرلز اور ججز۔ انہوں نے اپنے دور میں اپنے اختیارات کا جو ناجائز استعمال کیا۔ بدعنوانیاں کیں اسے چھپانے کے لیے یہ اپنی یادداشتوں میں خود کو قوم کا ہمدرد اور معصوم ثابت کرتے ہیں۔ اگر ان کے جھوٹ کو ثابت نہیں کیا گیا اور ان کی غلط بیانیوں سے پردہ نہ اٹھایا گیا تو یہ تاریخ کا حصہ بن کر معاشرے کو گمراہ کریں گے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ''شہاب نامہ'' کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

''شہاب نامہ'' جھوٹ اور غلط بیانی کا پلندہ ہے۔ ان صاحب نے اپنی زندگی میں جس قدر غلط کام کئے تھے، ان پر پردہ ڈالنے کے لئے اس قدر ضخیم کتاب لکھی ہے۔

لیکن ان کے اس جھوٹ اور غلط بیانی کا پردہ ضرور چاک ہوا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ ایوب خان کے بہت قریب تھے انہوں نے ہی پروگریسو پیپر کو بند کرایا اور اس کے بعد پاکستان ٹائمز کا Editorial بھی لکھا۔ انہوں نے ہی ایوب خان کی حمایت کے لیے ادیبوں کو جمع کر کے رائٹرز گلڈ بنائی اور انہوں نے ہی ایوب خان کی مقبولیت کے لئے پروپیگنڈا کیا۔ لیکن اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ جمہوریت پسند اور صوفی بن گئے ان کی کتاب میں سیاست کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ ان کی یہ کتاب ضخیم اور مہنگی ہونے کے باوجود ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بہت مقبول ہوئی۔ اس سے لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حقیقت کے بجائے جھوٹ کو پسند کرتے ہیں اور اسی کو وہ تاریخ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تاریخ سے جھوٹ کا پردہ اٹھاتا ہے تو ایسا مورخ ان کی نظر میں ملک و وطن کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں مسخ شدہ تاریخ کو درست کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔

بلند اقبال

کیا ہمارے حکمران اپنی یادداشتیں خود لکھتے ہیں یا لکھواتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

اوّل تو ہمارے حکمرانوں کی یادداشت ہی بہت کمزور ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی میں اپنی پوزیشن کو وقت کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں جسے ہم موقع پرستی کہتے ہیں۔ ہمارے دو حکمرانوں کی دو یادداشتیں ضرور شائع ہوئی ہیں اور یہ دونوں ہی فوجی آمر تھے۔ یعنی ایوب خان اور جنرل پرویز مشرف، ان کی اپنی پوزیشن کی وجہ سے ان کے پاس ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ان سے انٹرویو لے کر اور ان کی باتیں سن کر اچھے اور خوبصورت انداز میں ان کی یادداشتیں لکھ دیتے تھے۔ اکثر ان لکھنے والوں کے نام بھی لوگوں میں گردش کرتے تھے۔ لیکن تربیت یافتہ مورخ کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ ان کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کی اصلیت کو سامنے لے آتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اس ساری گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ کس طرح تاریخ کو ریاست کے لئے مسخ کیا جاتا ہے؟ کس طرح شخصیتوں کو مقدس بنایا جاتا ہے؟ اور کس طرح حقیقتوں کو چھپایا جاتا ہے؟ لیکن یہاں میں یہ سوال ضرور کروں گا کہ اس سارے عمل میں ہمارے لوگوں کا کیا رویہ ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے جو لوگوں کے بارے میں سوال کیا ہے تو اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تاریخ کے بارے میں لوگوں کا رویہ بھی منفی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ہم لوگوں کی

تاریخ نہیں لکھ رہے۔ بلکہ حکمرانوں کی تاریخ ہے جو سازشوں سے بھری پڑی ہے۔ لہٰذا افسوس کی بات ہے کہ ہمارے معاشرے کو اس کی پرواہ نہیں ہے کہ سرکاری تاریخ کے مقابلے میں کوئی متبادل تاریخ لکھی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو اپنی تحقیق میں آزاد ہو۔ میں نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ ایک خودمختار تحقیقی ادارہ بنایا جائے مگر اس میں قطعی ناکامی ہوئی۔ اس لئے ہم محدود دائرے میں رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ مثلاً ہم سہ ماہی تاریخ کا جنرل شائع کرتے ہیں جس میں تحقیقی مقالات ہوتے ہیں اور تاریخ پر جو نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کا تعارف کراتے ہیں۔ ہر سال ہم تاریخ کی کانفرنس کرتے ہیں جو اسی اہم موضوع پر ہوتی ہے۔ اب تک ہم نے جن موضوعات پر یہ کانفرنسیں کی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: جمہوریت، قانون، تحریک نسواں، نیشنل ازم، کالونیل ازم اور نصابی کتب وغیرہ کیونکہ ہمارا یہ دائرہ محدود ہے اس لئے اس کے اثرات بھی محدود ہیں، لیکن ہم تاریخ کا ایک متبادل نظریہ ضرور پیش کر رہے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا ہندوستان میں بھی تاریخ کا یہی حال ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

نہیں بالکل نہیں، ہندوستان میں تاریخ کا مضمون بہت مقبول ہے۔ اور وہاں بین الاقوامی شہرت کے مورخ موجود ہیں۔ ان کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اور تاریخ کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھا جا رہا ہے۔ جیسے نیشنل ازم، فیمنزم، مارکس ازم اور کلچر کی مختلف جہات سے، مورخوں کا ایک مکتبہ فکر جو سبالٹرن (Subaltern) کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ برطانوی دور میں جو تاریخ گم ہوگئی تھی اسے تلاش کر کے لکھا جائے۔ اس کے علاوہ تاریخ کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے بھی لکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں ریاستی اور غیر ریاستی ادارے بھی ہیں، جو تحقیق میں مصروف ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ پر بڑی تعداد میں

تحقیقی جرنلز شائع ہوتے ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر کتابیں چھپ رہی ہیں اور انڈین ہسٹوریکل کانگرس میں جس کا ہر سال پابندی سے اجلاس ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً تین ہزار مورخ حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تقسیم ہند اور اس کی سیاست سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ اگر ہمارے ہندوستان سے دوستانہ تعلقات ہوں تو ہم بہت کچھ ان کے مورخوں سے سیکھ سکتے ہیں۔

بلند اقبال

آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اس اہم موضوع پر بات کی اور اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔

☆.....☆.....☆

9- ہندوستان اور پاکستان میں جمہوریت

بلند اقبال

جمہوریت کی ایک تعریف تو وہ ہے جو ابرہام لنکن نے کی ہے یعنی ایسی حکومت جو لوگوں کی ہو، لوگوں سے ہو اور لوگوں کے لئے ہو، لنکن کا کہنا یہ ہے کہ ووٹروں کے ساتھ چند منٹ گزارنا، جمہوریت کی روح سے آشنا ہونا ہے۔ نیلسن منڈیلا کا کہنا ہے کہ جمہوریت سوسائٹی کو توانا اور صحت مند بناتی ہے۔ لیکن یہاں میرے ذہن میں سوال آتا ہے کہ جمہوریت میں ایک عام آدمی اور تعلیم یافتہ شخص کے ووٹوں کو برابر کی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ بات کہاں تک جمہوریت کو مضبوط کرتی ہے یا اُسے نقصان پہنچاتی ہے۔ اور یہ کہاں تک ممکن ہے کہ امریکہ اور یورپ جیسے ترقی یافتہ خطوں کی جمہوریت کو ایشیا اور افریقہ کے پسماندہ ملکوں میں نافذ کیا جائے؟ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے ہمارے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر مبارک علی موجود ہیں۔ میں ان سے وضاحت چاہوں گا؟

ڈاکٹر مبارک علی

پہلی بات جو آپ نے کہی کہ ایک عام آدمی اور ایک پڑھے لکھے آدمی میں فرق ہونا چاہیے، علامہ اقبال بھی یہی کہتے تھے کہ:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہ ایک تعلیم یافتہ طبقے کی رعونت ہے کہ وہ ایک عام آدمی کو جاہل کہہ کر اسے انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ لیکن تعلیم کی اگر تعریف کی جائے تو یہ کتابوں کو پڑھنے اور ڈگریوں کو حاصل کرنے کے علاوہ وہ بھی علم ہے جو ایک عام آدمی اپنے تجربات اور مشاہدات کے ذریعے حاصل کرتا ہے اور یہ اُسے باشعور شہری بناتا ہے۔ ہندوستان میں جب بی جے پی نے شائننگ انڈیا کا نعرہ لگا کر انتخابات میں حصہ لیا تھا اور جسے جیتنے کی بڑی توقعات تھیں لیکن انتخابات میں عام لوگوں کے ووٹوں نے جن میں نچلی ذات کے لوگ شامل تھے انہوں نے بی جے پی کو شکست دے دی اس پر ہمارے دوست اور ہندوستان کے مشہور مورخ ہربنس موکھیا نے فون پر مجھ سے کہا کہ آج پھر ہندوستان کے غریب اور جاہل عوام نے اس ملک کو مذہبی جنونیوں سے بچا لیا۔ اگر مسلسل انتخابات ہوں تو اس عمل سے عام لوگوں کو ووٹ کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ خاص طور سے ایک غریب آدمی کے لیے اس کا ووٹ ایک قیمتی اثاثہ بن جاتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنی پسند کے اُمیدوار کو چنتا ہے۔

اب آپ کے دوسرے سوال کی جانب آتا ہوں کہ کیا ترقی یافتہ ملکوں کی جمہوریت پسماندہ ملکوں میں قابلِ عمل ہوسکتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان ملکوں کی جمہوری حکومتوں میں عوام دوست حکمران بنیں تو وہ ریاستی اور جمہوری اداروں کے ذریعے لوگوں میں تعلیم اور آگاہی پیدا کر کے ارتقائی طور پر اُسے مستحکم کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کا تسلسل اس کی بقا اور زندگی کے لئے ضروری ہے۔

بلند اقبال

میں اپنا سوال یہاں سے شروع کروں گا کہ ہندوستان اور پاکستان میں جمہوریت کی راہ میں کون کون سی رکاوٹیں تھیں۔ سب سے پہلے ہم پاکستان کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہاں جمہوریت کیوں ناکام رہی؟

سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ برصغیر کی تقسیم نے ہماری سوسائٹی پر کیا اثر ڈالا۔ برطانوی دورِ حکومت میں ہم انگلستان کے بادشاہ کی رعایا تھے۔ رعایا ہونے کی حیثیت سے ہمارے کوئی حقوق نہیں ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ کا احسان ہوتا تھا کہ وہ اپنی رعایا کا خیال کرے، لیکن 1947ء کے بعد صورت حال اچانک بدل گئی اور ہم محکوم رعایا سے آزاد شہری ہوگئے جن کے بنیادی حقوق ہوتے ہیں اور وہ دستور کی بنیاد پر اپنے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ہندوستان کی طرح فوری طور پر دستور نہیں بن سکا۔ اور یہ بحث شروع ہوگئی کہ کیا دستور کو اسلامی ہونا چاہیے اور اگر اسلامی ہو تو کس نوعیت کا ہو۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان سے سید سلمان ندوی اور پروفیسر حمید اللہ کو بلایا گیا۔ علماء کا ایک بورڈ بنایا گیا۔ 1949ء میں قرار دادِ مقاصد کے ذریعے دستور کی بنیاد کا خاکہ پیش کیا گیا۔ اس دوران دستور ساز اسمبلی توڑی گئی منتخب وزیراعظم کو برخاست کیا گیا اور عدلیہ نے نظریہ ضرورت روشناس کرا کے سیاسی پیچیدگیوں کو بڑھایا اور پھر 1950ء میں جا کر 1956ء میں نیا دستور بنایا۔

اب آپ کا یہ سوال کہ جمہوریت کی راہ میں کون کون سی رکاوٹیں تھیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا جاگیرداری کا نظام، پیروں اور سجادہ نشینوں کی معاشرے میں اہمیت، نوکر شاہی کے وسیع اختیارات، پولیس، جاسوسی ادارے، اور برطانوی قانون کی موجودگی۔ یہاں میں اس واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ جب قصہ خوانی بازار میں پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج کیا اور گاندھی جی سے کہا گیا کہ لوگ اس کی مذمت کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ جب ہم اقتدار میں آئیں گے تو ہم بھی پولیس کو اسی طرح استعمال کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے ملک بنا تو لیا مگر اس کو کس طرح سے چلایا جائے اس بارے میں ان کا ذہن الجھنوں کا شکار رہا۔

ایک اور رکاوٹ جو جمہوریت کی راہ میں رہی وہ یہ تھی کہ ابتداء ہی سے قوم کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا کہ ہندوستان ہمارا دشمن ہے۔ اور ہمیں اپنی ساری توانائی اپنے دفاع

میں صرف کرنی چاہیے اس ذہنیت نے پاکستانی ریاست کو سیکورٹی اسٹیٹ بنا دیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ملک کے دفاع کی خاطر لوگ اپنے بنیادی حقوق قربان کر دیں، غربت، افلاس، جہالت، بے چارگی اور بے روزگاری کو قبول کر لیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب جہاں تک فیوڈل ازم کا تعلق ہے تو انڈیا میں بھی یہی حالت تھی وہاں انہوں نے اس کا کیا حل نکالا؟

ڈاکٹر مبارک علی

کانگرس پارٹی نے تقسیم سے پہلے اپنی آنے والی حکومت کی تیاریاں کر لی تھیں۔ 1937ء کے الیکشن کے بعد کانگرس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ آزادی کے بعد جاگیرداری کو ختم کر دیں گے۔ اس وجہ سے پنجاب اور سندھ کے جاگیردار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اپنے وعدے کے مطابق کانگرس نے زمینداری کا خاتمہ کر کے زمینداروں کو زمین کی قیمت بونڈز کی شکل میں ادا کی۔ اُس کے بعد راجاؤں اور نوابوں کی ریاستوں کا خاتمہ کیا جس کی وجہ سے معاشرے سے ان کے اثرات کم ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں بھی 1951ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ کیونکہ یہ صوبائی مسئلہ تھا اس لیے پاکستان کے دوسرے صوبوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک راہنما لطیف دانیال نے زرعی اصلاحات کا ایک منصوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ دولتانہ کو پیش کیا۔ مگر یہاں طاقتور زمینداروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ منظور نہیں ہو سکا۔ کیونکہ سابق مشرقی پاکستان میں اس کے خاتمے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں سیاست میں متوسط طبقے کے لوگ آئے جبکہ مغربی پاکستان میں سیاست پر زمینداروں کا تسلط رہا اس لئے ملک کے ان دونوں حصوں میں مختلف روایات رہیں۔ بنگالی، جمہوریت پسند رہے جبکہ مغربی پاکستانی زمینداروں اور پیروں کی گرفت میں رہے۔

بلند اقبال

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کے بنانے میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا حصہ تھا اور اسی لئے وہی آج سیاست پر غالب ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی بات درست ہے حمزہ علوی نے اس بارے میں لکھا ہے کہ پاکستان کو بنانے میں دو طبقوں کا اہم کردار رہا ہے۔ نمبر ایک یوپی کا تنخواہ دار طبقہ جسے وہ salaried کہتے ہیں۔ دوسرا پنجاب اور سندھ کے زمین دار۔ یوپی کے تنخواہ دار طبقے کا مفاد یہ تھا کہ نئے ملک میں انہیں ترقی کے زیادہ مواقع ملیں گے۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں یہی لوگ نوکر شاہی پر قابض تھے۔ زمیندار طبقہ سیاست میں بااثر تھا کیونکہ یہاں نظریاتی سیاست تو تھی نہیں اس لئے انتخابات میں ووٹ سجادہ نشینوں اور زمینداروں کو دیتے تھے ملک میں جتنی سیاسی پارٹیاں بنیں ان کے سربراہ بھی زمیندار اور جاگیردار تھے۔ پھر یہ پارٹیاں ان کی خاندانی جاگیریں ہوگئیں۔ اس لیے پاکستان میں عوامی جمہوریت کے بجائے جاگیردارانہ جمہوریت کا راج ہے۔ جاگیردارانہ راج کا تسلط اس قدر ہے کہ جب صنعت کار سیاست میں آئے تو انہوں نے بھی اس ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ اب اس وقت پاکستان میں جمہوریت دو یا تین خاندانوں کی گرفت میں ہے جس سے نجات کی راہ نظر نہیں آتی ہے۔

بلند اقبال

کیا فیوڈل کلچر کا اثر ہماری فوج سے لے کر تمام ریاستی اداروں میں موجود ہے جس کی وجہ سے جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں آئیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

اس سے پہلے میں نے آپ کو نوکر شاہی کے متعلق بتایا تھا کہ یہ کس طرح لوگوں کے مسائل کو فائلوں میں داخل کر کے انہیں سلجھانے کی بجائے الجھا دیتے ہیں اور یہ اس وقت حل ہوتے ہیں جب رشوت سے کام چلایا جائے۔ یہی حال عدالتوں کا ہے۔ جہاں لوگ مقدمات میں اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ یہ دونوں ادارے آزادی کے بعد مزید خراب ہوئے ہیں۔ ان میں سدھار نہیں آیا ہے۔

لیکن جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فوج رہی ہے۔ فوجی لیڈروں کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ ان کا ادارہ سب سے زیادہ منظّم اور باقاعدہ جدید خیالات سے ہمکنار اور باصلاحیت افسروں پر مبنی ہے جبکہ سیاست دان غیر منظّم، بدعنوان، نااہل اور حکمرانی کی صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ اس لئے ملک و وطن کی محبت انہیں مجبور کرتی ہے کہ ملک کو سیاستدانوں سے چھٹکارا دلوائیں اور خود حکومت پر قابض ہو کر ملک وقوم کی اصلاح کریں۔ لہٰذا 1956 کے دستور کے بعد جبکہ جمہوری عمل شروع ہونے والا تھا، 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لا لگا کر اس عمل کو روک دیا۔ انہوں نے 1962ء کا نیا دستور بنایا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کی۔ طلبہ یونینز کو ختم کیا۔ نیا تعلیمی نصاب مرتب کیا۔ زرعی اصلاحات بھی کیں مگر ان کے دس سالہ دورِ حکومت میں ملک معاشی، سیاسی اور سماجی طور پر ترقی کی بجائے پسماندہ ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد یحیٰی خان کی فوجی آمریت آئی جس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے سابق مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے نتیجے میں بنگلہ دیش آزاد ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ فوجی آمروں نے ملک کے ایک حصے کو کھو دیا اور اس کا کوئی افسوس بھی نہیں کیا۔

پاکستان کی تاریخ کا دوسرا دور بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ہوتا ہے۔ جب مغربی پاکستان صرف پاکستان بن جاتا ہے۔ ایک بار پھر یہاں جمہوریت کا تجربہ ہوتا ہے۔ اور ایک بار پھر سیاست دان آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کی وجہ سے ملک کو بحرانوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایک بار پھر انتخابات کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں اور ایک بار پھر یہاں فوجی آمریت

آ جاتی ہے تا کہ ملک کو سیدھے راستے پر گامزن کیا جائے۔ یہ جنرل ضیاء کی فوجی آمریت تھی۔

بلند اقبال

اب یہاں میں آپ سے ایک سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ پاکستان کی سیاست میں جو مذہبی سوچ آئی ہے تو کیا اس کی بنیاد سعودی عرب ہے۔ اور کیا سعودی بادشاہت اور اس کے مذہبی عقیدے سے پاکستانی معاشرہ متاثر ہوا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

ہمارے معاشرے میں سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمان امت واحدہ ہیں۔ جب کہ تاریخ میں مسلمان کبھی متحد نہیں رہے۔ وہ ہمیشہ سیاسی اور فرقہ وارانہ لحاظ سے تقسیم رہے ہیں اور آپس میں جنگ و جدل بھی کرتے رہے ہیں۔

بلند اقبال

ماضی میں عرب ہندوستان میں صدقہ و زکوٰۃ کا پیسہ لینے آیا کرتے تھے۔ مغل دور میں شاہانِ عرب سفیروں سے ملنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے اور انہیں مالی عطیہ دے کر رخصت کر دیتے تھے۔ عربوں سے ہمارے تعلقات کی نوعیت اس وقت بدلی جب وہاں پٹرول دریافت ہوا۔ بغیر محنت کے ان کے پاس دولت آئی تو انہوں نے وہابی عقیدے کی تبلیغ کے لئے مولوی کو خطیر رقومات دیں جس کی وجہ سے مدرسوں اور مسجدوں میں ان کے اثرات بڑھے۔ پاکستان میں مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہوئے۔ شیعہ سنی اختلافات بڑھے اور لوگوں میں عربی کلچر مقبول ہوا یہ اثرات اس وقت اور زیادہ بڑھے جب پاکستانی مزدور طبقہ عرب ملکوں میں مزدوری کی خاطر گیا اور وہاں سے اس کلچر کو امپورٹ کیا جبکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تاریخی طور پر ایران سے تعلق رہا ہے۔ عرب سے نہیں، فارسی زبان کی وجہ سے یہاں ایرانی کلچر زیادہ غالب تھا۔ اب جہاں تک مذہبی جماعتوں اور سیاست کا تعلق ہے تو اسلامائزیشن کے عمل کی جو 1949ء میں

قرارداد مقاصد سے شروع ہوا تھا اور پیپلز پارٹی اور ضیاء الحق کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اس نے نہ صرف مذہبی بلکہ لبرل سیاسی جماعتوں کو بھی مذہبی بنا دیا اور انتخابات کے موقعوں پر نظامِ مصطفےٰ اور شریعتِ محمدیؐ کے نعروں کے ذریعے لوگوں سے ووٹ لئے گئے۔ اس لئے اب کوئی جماعت بھی بغیر مذہبی نعروں کے ووٹ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب سندھ اور بلوچستان کا جمہوریت کے بارے میں کیا رویہ رہا؟

ڈاکٹر مبارک علی

ابتداء ہی سے صوبوں کی جانب وفاق کی پالیسی دوستانہ نہیں تھی کیونکہ وفاق میں پنجاب کا تسلط تھا اس لئے وہ صوبوں کی تاریخ زبان اور کلچر نظر انداز کر کے انہیں ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے سندھ میں جمہوریت کے خلاف مخالفانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ جی ایم سید کا کہنا تھا کہ کیونکہ پنجاب اکثریتی صوبہ ہے اس لئے انتخابات میں ان ہی کی اکثریت جیتے گی اور سندھی ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے اس وجہ سے جمہوریت ان کے فائدے میں نہیں ہے۔ سندھ دیش کا نعرہ اسی ذہن کی عکاسی تھی۔ بلوچستان میں جہاں قبیلے کے سردار طاقتور تھے وفاق نے ان کے لے دو قسم کی پالیسی اختیار کی۔ ایک یہ کہ کچھ سرداروں کو خرید کر حمایتی بنا لو اور جو مخالفت کریں انہیں سختی سے کچل دو۔ اس پالیسی نے بلوچستان کے عوام کے کچھ نہیں دیا اور ان کے لئے جمہوریت بے معنی رہی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب میں یہاں آپ سے ہندوستان کی جمہوریت کے بارے میں وضاحت چاہوں گا؟

ہندوستان کی جمہوریت کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہاں جمہوریت کی ابتداء خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے دستور میں ریاست کو سیکولر بنایا اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لئے بنیادی حقوق کا اعلان کیا لیکن ان کی سوسائٹی کا ذہن سیکولر نہ ہوسکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سب سے پہلے گاندھی جی نے مذہب کو سیاست کا حصہ بنایا تھا ورنہ ان سے پہلے کانگریس ایک سیکولر پارٹی تھی اور اس کے اہم رہنما جن میں گوکھلے، فیروزشاہ، مہتا، بدرالدین طیب جی اور محمد علی جناح شامل تھے یہ سب سیکولر ذہن کے لوگ تھے۔ مذہب اور سیاست کے اس ملاپ کی وجہ سے ہندو مذہبی سیاسی جماعتیں مقبول ہونا شروع ہوئیں اور بی جے پی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ 1992ء میں بابری مسجد کو مسمار کیا گیا اور ایڈوانی کی رتھ یاترا نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا۔ اس لئے جب بی جے پی اقتدار میں آئی تو اس نے ریاستی اداروں کی مدد سے ہندو مذہب کے تسلط کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ نصاب کی کتابیں بدلی گئیں۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ تعصّبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ اب دوبارہ سے جب بی جے پی اقتدار میں آئی ہے تو وہ پھر اسی مذہبی انتہا پسندی کا اظہار کر رہی ہے۔ گائے کے ذبح پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ اچھوت لوگوں کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ شاہراہوں کے نام تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر اس رویے کے خلاف مزاحمت بھی جاری ہے۔ دانشوروں، آرٹسٹوں اور فلم بنانے والوں نے احتجاجاً اپنے ایوارڈ واپس کر دیئے اور بی جے پی کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مورخوں نے تاریخ کو مسخ ہونے سے روکا۔ نصابی کتابوں کو درست کیا اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اس لئے ہندوستان کی جمہوریت میں یہ مزاحمت اُمید کی کرن پیدا کرتی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ذرا یہ بتایئے گا کہ فوجی افسران کو ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف زمین دی جاتی ہے بلکہ بہت سی دوسری مراعات کے بھی حقدار ہوتے ہیں۔ لہٰذا فوجی عہدیدار اور سیاست دان دونوں بہت پیسہ لے کر امریکہ اور کینیڈا آتے ہیں اور یہاں شاندار مکانات اور قیمتی جائیدادیں خریدتے ہیں۔ تو یہ کرپشن جمہوریت کے لئے کس قدر نقصان دہ ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

برطانوی حکومت کے زمانے میں یہ روایت تھی کہ وہ ریٹائرڈ فوجیوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ روایت جاری رہی۔ سندھ میں فوجی عہدیداروں اور نوکر شاہی کے افراد کو بیراج کی زمینیں دی گئیں۔ ان زمینوں کے ساتھ آب پاشی کی سہولتیں بھی دی جاتی ہیں لیکن جس طرح سے یہ زمینیں دی جا رہی ہیں ایک وقت آئے گا کہ جب دینے کے لئے زمینیں نہیں ہوں گی تو اس صورت میں پھر دوسروں پر قبضہ کیا جائے گا۔

پاکستان میں اس وقت سب سے زیادہ تجارت Real Estate کی ہے۔ جس میں بے تحاشہ پیسہ کمایا جا رہا ہے۔ اس کی ایک مثال بحریہ ٹاؤن کی ہے لیکن یہ نئی کالونیاں ہاؤسنگ کے مسئلے کو حل نہیں کر پا رہیں عام لوگوں کی بڑی تعداد کچی آبادیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے۔

معاشرے میں امیر و غریب کے درمیان بہت فرق بڑھ گیا ہے۔ یہ دو قومی نظریہ ہمارے ہاں ایک دوسری ہی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ایک طرف دولت اور سہولتیں ہیں۔ دوسری جانب محرومی اور بے بسی۔ بے روزگاری جرائم کو بھی پیدا کر رہی ہے اور مذہبی انتہا پسندی کو بھی۔ یہ ایسی صورتِ حال ہے جیسا کہ فرانس میں 1978ء سے پہلے کی تھی۔ ابھی یہاں فسادات ہو رہے ہیں۔ یہی فسادات آگے چل کر خانہ جنگی کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ جمہوریت یا فوجی آمریت جب انہیں کچھ نہ دے سکے تو پھر تشدد کا راستہ ہی باقی بچتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ کہاں تک درست ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فوجی آمریتوں کے دور میں ملک اقتصادی طور پر مضبوط رہا۔ مگر جب بھی جمہوریت آئی اور سیاست دانوں کا تسلط رہا تو لوٹ کھسوٹ نے ملک کو معاشی طور پر غیر مستحکم کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ہے کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے امریکی امداد آئی اس کا غلط استعمال ہوا۔ دہشت گردی ختم نہیں ہوئی اور اس نے جمہوریت کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان کی تاریخ میں یہ حادثات بار بار ہو رہے ہیں کہ جب بھی جمہوریت آتی ہے سیاستدانوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کی نااہلی ملک میں انتشار پیدا کرتی ہے اور جب فوجی آمریت ملک میں جمہوریت کا تختہ الٹ کر اقتدار میں آتی ہے تو لوگوں کو اطمینان اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ جب ایوب خان کا پہلا مارشل لا لگا تو لوگوں میں اس کا ڈر اور خوف تھا اس لئے کچھ وقت کے لئے اشیاء میں ملاوٹیں کم ہو گئیں اسمگلنگ رک گئی ہر طرف صفائی نظر آنے لگی اور یہ پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ ملک معاشی طور پر ترقی کر رہا ہے۔ مگر ان کی دس سالہ حکومت کے خاتمہ پر پتہ چلا کہ ترقی کا یہ سارا ڈرامہ تھا اور معاشرہ مزید پسماندہ ہوا ہے۔ اس کے بعد سے جتنے بھی مارشل لا آئے انہوں نے فوجی ادارے کو تو مضبوط کیا مگر ساری جمہوری قوتوں کو توڑ دیا جیسے طلبہ یونینز، ٹریڈ یونینز، سیاسی جماعتیں، صحافت کی آزادی، دانشوروں کی آزادی۔ سنسر شپ نے تمام ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کو روک دیا اس صورت میں اکیلی فوج منظّم ادارے کے طور پر باقی رہ گئی لہٰذا اب یہ اس قدر مضبوط ادارہ ہے کہ جمہوریت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

فوج کا ادارہ اس وقت اور بھی زیادہ مضبوط ہوا جب افغانستان میں روسی آئے اور پاکستان نے امریکی امداد لے کر افغانستان میں مداخلت کی۔ اسی مداخلت نے طالبان کو پیدا کیا اور اسی نے دہشت گردی کو جنم دیا۔ ان حالات نے جمہوری اداروں کو سخت نقصان پہنچایا۔

یہاں میں یہ بھی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ایک طرف تو غیر ملکی قرضوں نے پاکستان کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ دوسری جانب بڑھتی ہوئی کرپشن نے پوری سوسائٹی کو بدعنوانیوں میں الجھا کر ملک کے مفاد سے بہت دور کر دیا ہے۔ اب اس وقت سیاست میں پیسے کی بہت اہمیت ہے۔ الیکشن بھی پیسے کے ذریعے جیتے جاتے ہیں اور عوام اور ان کے مسائل سے سیاستدانوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب میں ابھی ملائیشیا گیا تھا تو وہاں میں نے جمہوری حکومت کی کارکردگی کو دیکھا تو میں بڑا متاثر ہوا تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ملائیشیا، انڈونیشیا اور جنوبی کوریا کے سیاسی تجربات سے سیکھیں اور اپنے ملک میں جمہوری نظام کو مستحکم کریں۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی بات بالکل درست ہے کیونکہ ہمارے سامنے جمہوریت کے دو نمونے ہیں ایک مغربی جمہوریت خاص طور پر انگلستان کی جہاں ارتقائی طور پر جمہوری روایات کی بنیاد پڑی۔ ابتداء میں وہاں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان کشمکش رہی اور بتدریج اس نے اپنے اختیارات کو بڑھایا۔ یہاں تک کہ 1688ء میں شاندار انقلاب نے پارلیمنٹ کو ایک طاقتور ادارہ بنایا۔ 1832ء عیسوی میں ایک ریفارم ایکٹ کے ذریعے متوسط طبقے کو ووٹ کا حق ملا اور پھر 1867ء اور 1880ء کی دہائی میں ووٹروں کی تعداد بڑھی یہاں تک کے پارلیمنٹ کے اختیارات بادشاہ سے زیادہ ہوگئے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں انقلاب کے ذریعے جمہوری حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ تو ایک تو یہ ماڈل ہے جسے ہم مغربی جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔ کوریا میں اس کی ابتداء پارک چنگ ہی (Park Chung Hee) سے ہوئی جو خود ایک غریب خاندان سے تھا اور جس نے اقتدار کے بعد دو کام کئے ایک تو جاگیرداری کا خاتمہ کیا اور ادوسرا سب کے لئے تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا۔ اس کی بنیاد پر آگے چل کر کوریا میں تبدیلی

آئی۔ وہاں آمریتوں کا خاتمہ ہوا اور جمہوری نظام قائم ہوا۔ سنگاپور میں لی کوان (Lee Kuan) نے نہ صرف جمہوریت کو قائم کیا بلکہ اسے صنعتی ملک بھی بنایا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے سامنے دو چیزیں تھیں یا تو خود کو امیر بنالے یا ملک کو۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما ملک کی بجائے خود کو امیر بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ملائیشیا میں مہاتیر محمد نے اس کے سیاسی اور معاشی نظام کو بدل کر دنیا کے سامنے جمہوریت کا یہ نمونہ پیش کیا ہے۔ وہاں پر MALYS اور چینی دو کمیونیٹیز ہیں اور یہ دونوں اپنے مذہبی اختلاف اور مختلف کلچر کے باوجود پرامن طریقے سے ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔

آپ کا یہ کہنا کہ پاکستانی عوام میں شخصیت پرستی کے جذبات ہیں۔ یہ درست ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے عوام ایسی شخصیتوں کی پرستش کرتے ہیں جنہوں نے انہیں کچھ دیا نہیں ہے۔ اس لئے یہاں سیاسی رہنما اپنے لیے خطابات تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن عملی میدان میں نااہل ثابت ہوئے ہیں۔

اگرچہ ملک کے حالات افسوناک ہیں، اشرافیہ کا طبقہ دولت مند اور مراعات یافتہ ہے، عوام مجبور اور بے بس ہیں۔ لیکن ہم تاریخ سے ایک سبق ضرور سیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان برابر نا انصافی اور ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتا رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ایک وقت آتا ہے کہ جب یہ پورا نظام بدلتا ہے اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق ملتے ہیں۔ اس لئے پاکستان میں بھی نا اُمیدی کے بجائے اُمید کرنی چاہیے کہ یہاں بھی تبدیلی آئے گی، وقت بدلے گا اور عوام کی آواز سنی جائے گی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے نا اُمیدی کے اس ماحول میں ہمیں اُمید دلائی۔ میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس اہم موضوع پر ہم سے گفتگو کی۔

☆.....☆.....☆

10- سیکولرازم اور تہذیبوں کا تصادم

بلند اقبال

آج ہم ایک اہم مسئلے پر بحث کرنا چاہیں گے اور وہ یہ ہے کہ آخر کیوں مغرب میں نشاۃِ ثانیہ، سائنسی انقلاب، روشن خیالی کی تحریک اور صنعتی انقلاب نے اس کو مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ انہی تحریکوں میں سے ایک سیکولرازم کے افکار اور خیالات ہیں۔ اگرچہ مغرب کی اکثریت کا مذہب عیسائیت ہے۔ مگر اس نے سیکولرازم کو قبول کر کے اپنے معاشرے میں بنیادی تبدیلی کی کیا وجہ ہے کہ سیکولرازم اسلامی دنیا میں نافذ نہیں ہوسکا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم تمام مغربی افکار کو جن میں سوشل ازم، نیشنل ازم، فیمن ازم اور سیکولرازم شامل ہیں۔ انہیں اپنے معاشرے میں اجنبی پاتے ہیں اور اپنی راوایات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال بھی آتا ہے کہ کیا فلسفہ اور سیاست کے افکار و نظریات کا کوئی مذہب ہوتا ہے یا یہ کسی خاص جغرافیائی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور یا یہ انسانی تہذیب کا ورثہ ہوتے ہیں۔ آج میں اس اہم موضوع پر پروفیسر مبارک علی سے گفتگو کروں گا تا کہ ہمارے ذہنوں میں جو سوالات ہیں ہمیں ان کا جواب مل سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے سیکولرازم کے بارے میں جو سوال کیا ہے اس کے بارے میں اسلام اور عیسائیت دونوں مذاہب میں جو رویے رہے ہیں ان کے بارے میں کہنا چاہوں گا سیکولر کی یہ

اصطلاح تو عیسائی معاشرے میں بہت پہلے سے موجود تھی جس کی بنیاد حضرت عیسیٰؑ کا یہ مقولہ تھا کہ جو حصہ قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔ یعنی ریاست اور مذہب کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ عیسائی ملکوں میں ریاست اور چرچ کی اتھوریٹیز جدا جدا ہیں۔

اس لئے اگر ہم سیکولرازم کو قدیم ہندوستانی سوسائٹی میں دیکھیں تو یہاں یہ مذہبی روا داری کی شکل میں نظر آئے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی امپیریل ریاست بنتی ہے تو اس میں کئی قوموں اور مذاہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کے ساتھ رواداری اور احترام کا سلوک کیا جائے۔ مثلاً موریہ خاندان کے حکمران اشوک نے اگرچہ بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مگر اپنی سلطنت میں رہنے والے تمام مذاہب کے پیروکاروں کا احترام کیا اور اپنے مذہبی تعصب کو سیاست میں داخل نہیں ہونے دیا۔

اسلامی تاریخ میں مذہب اور سیاست کی علیحدگی کو ہم عباسی دورِ حکومت میں دیکھتے ہیں۔ جب ایران کی بیوروکریسی نے ریاست کو علماء کی گرفت سے آزاد کرا لیا تھا اور ریاست اپنے مفادات کے تحت قانون اور پالیسی بناتی تھی۔ علماء کو مذہبی معاملات میں تو اختیارات تھے مگر سیاست سے ان کا تعلق ختم کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ ماڈل تھا جو آگے چل کر وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں جاری رہا۔ ہندوستان میں بھی سلاطین کے عہد میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ علاؤالدین خلجی کا کہنا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کرتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ مذہبی لحاظ سے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اسی عہد کے ایک مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب فتاویٰ جہانگیری میں لکھا ہے کہ آئینِ جہاں بانی اور شریعت میں فرق ہے دونوں کو ملانا نہیں چاہیے۔ مغل دورِ حکومت میں اکبر کی صلحِ کُل کی پالیسی بھی اسی سوچ کا مظہر تھی۔ یہاں تک کہ جب کسی نے اورنگ زیب سے سوال کیا کہ اس نے اعلیٰ عہدوں پر شیعہ مسلک کے لوگوں کو کیوں فائز کر رکھا ہے۔ تو اس کا جواب بھی یہی تھا کہ مذہب اور سیاست کو آپس میں نہیں ملانا چاہیے۔ لہٰذا یہ ایک رویہ تھا اس کو چاہے آپ سیکولرازم کا نام دیں یا اس کے لئے کوئی اور

اصطلاح استعمال کریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سیاست جو بادشاہت اور ریاست کے مفادات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور جو کامیابی کے لئے اخلاقی قدروں کو بھی پامال کرتی ہے۔ اسے مذہب سے جوڑ کر نہیں رکھا جائے۔

بلند اقبال

ہم دیکھتے ہیں کہ اصطلاحات کے معنی وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہی صورتِ حال سیکولرازم کی بھی ہے جسے اسلامی دنیا میں ایک دوسرے مفہوم کے ساتھ سمجھا جاتا ہے اب میں چاہوں گا کہ آپ سیکولرازم اور عیسائیت کے بارے میں بتائیں کہ ان دونوں کا کیا باہمی تعلق ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

عیسائی مذہب کی ابتداء رومی عہد میں اس وقت ہوئی جب رومی سلطنت اپنے عروج پر تھی، ابتدائی دور میں عیسائی مذہب کے ماننے والے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے رومی سلطنت کو چیلنج نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس سیاسی طاقت اور اقتدار نہیں تھا۔ اس لئے وہ رومی سلطنت کے تابع تھے۔ ان کی خاموش تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور صورتِ حال اس وقت تبدیل ہوئی جب 313 عیسوی میں رومی شہنشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اور اس کی سرپرستی کرتے ہوئے عیسائی چرچ کو اپنی سلطنت میں پھیلایا چنانچہ اس کے عہد میں ریاست اور چرچ آپس میں مل گئے مگر فرق یہ تھا کہ ریاست طاقتور تھی اور چرچ کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتی تھی۔ جب رومی سلطنت مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم ہوئی تو بازنطینی سلطنت میں شہنشاہ کو چرچ پر پورا پورا اختیار تھا۔

رومی سلطنت کے مغربی حصے میں پوپ عیسائیوں کا روحانی رہنما بن کر اُبھرا اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ یورپ کے تمام ملکوں میں چرچ کی بالادستی قائم رہے۔ جس کی وجہ سے یورپ کے حکمران اپنی ہی ملکوں میں پوری طرح سے بااختیار نہ تھے۔ اس لئے 1517ء

عیسوی میں جب لوتھر نے پوپ کے خلاف بغاوت کی تو جرمن حکمرانوں نے اس کا ساتھ دیا، تا کہ وہ خود کو چرچ سے آزاد کرا سکیں۔ ریفارمیشن نے عیسائی دنیا کو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ جب جرمن میں ان دونوں فرقوں کے درمیان تین سال تک جنگیں رہی اور 1648ء میں ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے بعد یہ ختم ہوئیں تو اس کے نتیجے میں قومی ریاست کی بنیاد پڑی۔ دوسری جانب انگلستان میں ہنری ہشتم نے شادی کے مسئلے پر پوپ سے بغاوت کر کے اپنا قومی چرچ بنا لیا۔ لیکن قومی ریاست کی تشکیل امریکہ کی جنگِ آزادی کے بعد ہوئی جب اس کے بانیوں نے یونانی اور رومی تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ امریکہ کے دستور میں چرچ اور ریاست کو علیحدہ رکھا جائے۔ 1789ء کے فرانسیسی انقلاب نے بھی ریاست کو مذہب سے جدا کر کے اُسے قومی بنا دیا جس کے بعد سے ہر چیز قومی ہوگئی۔ یعنی قومی زبان، قومی ترانہ، قومی جھنڈا، اور قومی تعلیم وغیرہ۔ اس کے رہنے والے بھی چاہے ان کا کوئی بھی مذہب یا عقیدہ ہو، وہ سب ایک قوم ہوگئے۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی جس نے عیسائی دنیا کے یونیورسل تصور کو توڑ کر اُسے قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد سے یورپ میں جو بھی دساتیر بنے ان میں اس اصول کو قائم رکھا گیا کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار رہے گی اور اپنے شہریوں کو ان کے مذہب سے بالاتر ہو کر برابر کے حقوق دے گی۔

بلند اقبال

یہاں میں چاہوں گا کہ مغرب اور مشرق میں ہونے والی تبدیلیوں پر غور کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں سائنسی انقلاب، روشن خیالی کی تحریک، فرانسیسی انقلاب، یورپ کی یونیورسٹیوں میں سائنس اور سماجی علوم پر تحقیق، فلسفیانہ افکار کا پھیلاؤ اور جمہوری اداروں کا فروغ، ان سب نے مل کر یورپ سے چرچ کے اثر و رسوخ کو کمزور کیا اور لوگوں کے ذہنوں کو سیکولر بنانے میں مدد دی۔ کیا وجہ ہے کہ اسلامی ملکوں میں یہ عمل نہ ہو سکا اور معاشرہ عقیدے کی پابندیوں کی گرفت میں رہا؟ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں مصر، شام اور عراق میں قوم پرستی اور سیکولرازم کے تحت حکومتیں بنیں مگر مصر میں ناصر کی وفات کے بعد اس کا خاتمہ ہوا تو

عراق میں صدام حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد وہاں شیعہ سنی اختلافات اٹھے اور مذہب کا غلبہ ہوا۔ موجودہ حالات میں شام بھی جنگ و جدل کی صورت میں مذہبی انتہا پسندی کے نرغے میں ہے۔ افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد جو سیکولر حکومت قائم ہوئی تھی طالبان نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت تمام عالمِ اسلام مذہبی انتہا پسندی کے تسلط میں ہے۔ کہیں جمہوریت نہیں ہے۔ بلکہ بادشاہوں اور آمروں کا سیاسی اقتدار قائم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں سیکولرازم کو حاصل کرنے کے لیے ان تمام مراحل سے گزرنا ہوگا جن سے مغرب گزرا ہے؟ اور کیا سیکولرازم کا نظام ہماری روایات کے خلاف ہے اور اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ایک طرف تو سیکولرازم کا معاملہ ہے جس میں ریاست مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہوتی ہے لیکن دوسری اہم چیز یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کے لوگوں کا ذہن سیکولر ہو اور وہ مذہب کو اپنی نجی زندگی تک محدود رکھیں۔ یورپ میں جہاں ریاست اور مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں وہیں پر معاشرے میں مذہب کو نجی زندگی تک رکھ کر اُسے جھگڑے اور فساد سے دور رکھا ہے۔ یہاں پر میں ہندوستان کی مثال دینا چاہوں گا کہ ہندوستان کی ریاست اگرچہ سیکولر ہے۔ لیکن اس کا معاشرہ ذہنی طور پر سیکولر نہیں ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں مذہبی ہندو جماعتیں جارحانہ انداز میں اپنے عقیدے کا نفاذ چاہتی ہیں جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی نہ تو ریاست سیکولر ہے اور نہ ہی لوگوں کا ذہن۔ اس کی ریاست قومی بھی نہیں ہے کیونکہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ مساوی سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ سیکولرازم کو مغرب کا نظریہ کہہ کر اُس سے انکار کیا جاتا ہے اور یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس اپنا ضابطۂ حیات ہے اس لئے ہمیں اجنبی نظریات کی ضرورت نہیں۔ لیکن حقیقت میں ہمارے پاس اپنا کوئی ایسا مکمل نظام نہیں جو موجودہ حالات کے مطابق ہو۔

اب میں آپ کے اس سوال کا جواب دینا چاہوں گا کہ مشرقِ وسطی میں اٹھنے والی جمہوری اور سیکولر تحریکیں کیوں ناکام ہوئیں؟ جمال عبدالناصر کے زمانے میں عرب قوم پرستی کی تحریک اٹھی جس کی بنیاد مذہب کے بجائے عربی زبان پر تھی۔ جس میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی اور یہودی بھی برابر کے شریک تھے۔ مگر اس تحریک کی رہنمائی کرنے والے فوجی سربراہ اور آمر تھے۔ جنہوں نے جبر کے ساتھ لوگوں پر حکومت کی۔ عوام کی محرومیوں کے ساتھ امریکی اور یورپی مداخلت نے ان تحریکوں کا خاتمہ کر دیا اس لئے مصر میں ناصر کے بعد اور عراق میں صدام کے بعد جو مذہبی قوتیں دبی ہوئی تھیں وہ ابھر کر آئیں۔ افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب کی ناکامی ایک تو ان کی اپنی سازشوں کے نتیجے میں اور دوسرے امریکہ کی دخل اندازی کی وجہ سے ہوئی۔ اگر ان تحریکوں کی ناکامی کا تجزیہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تمام اسلامی ملکوں میں نچلی سطح پر لوگوں کے ذہن کو نہ تو بدلنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی ان کے بنیادی معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کیا گیا۔ اس لئے لوگوں نے اپنی حفاظت اور مسائل کے حل کی خاطر مذہب میں پناہ لی۔ لوگوں کے اس مذہبی ذہن کا سیاست دانوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لئے مذہبی نعروں کو استعمال کیا۔ سیاست دانوں کے لئے معاشرے کی پسماندگی فائدہ مند ہے۔ اس کی وجہ سے لوگ ان کی سرپرستی چاہتے ہیں۔

بلند اقبال

لبرل، سیکولر اور بائیں بازو کی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں کے درمیان ایک فرق نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مذہبی جماعتیں نچلی سطح پر عوام سے جڑی ہوئی ہیں۔ وہ گاؤں گاؤں، شہر، شہر اور گلی کوچوں میں جا کر عام لوگوں سے باتیں کرتے ہیں۔ جبکہ بائیں بازو کی جماعتیں یا تو اپنے نظریاتی جھگڑوں میں مصروف ہیں اور یا پھر غلط طریقے سے روایات کا مذاق اُڑا کر جارحانہ انداز میں اُن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک عوام سے جُڑ کر اور ان کے مسائل سے واقف ہو کر ان سے بات نہ کی جائے گی اس وقت تک تبدیلی کے امکانات پورے ہوتے نظر نہیں آئیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی یہ بات بالکل درست ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر ترقی پسند تحریکیں کمزور رہی ہیں اور اس کی وجوہات ہیں حکومت کی جانب سے پابندیاں، مخبروں اور جاسوسوں کی نگرانی، قید و بند کی سختیاں، روزی اور معاش کے دروازوں کو بند کر دینا، عوام میں ان کے خلاف منفی پروپیگنڈا، ان حالات کی وجہ سے یہ کھل کر کام نہیں کر سکے۔ دوسرے ان کی معاشی ذرائع محدود رہے۔ تیسرے روس اور چائنہ کی حکومتوں سے ہدایات لیں۔ چوتھے خود اپنے درمیان نظریاتی اختلافات نے انہیں تقسیم رکھا۔ ان کے مقابلے میں مذہبی جماعتوں کو فوقیت رہی۔ ان کے پاس مسجد اور مدرسہ دو اہم ادارے تبلیغ کے لئے موجود تھے۔ لوگوں کی جانب سے مالی تعاون حاصل ہوتا رہا۔ ان کے اخبار، رسالے اور کتابیں شائع ہوتی رہیں اور چونکہ انہوں نے معاشرے کی روایات سے بغاوت نہیں کی بلکہ اسے سہارا دیا۔ اس لئے لوگوں کا ان کے ساتھ تعاون رہا۔ ان کے مقابلے میں ترقی پسند طبقے اور ان کے دانشور بہت حد تک کمزور ہیں اور اس مذہبی انتہا پسندی کے سامنے بے بس ہیں۔ کیونکہ ریاست اور اس کے قوانین ان کے نظریات کے خلاف ہیں۔

بلند اقبال

جس طرح مذہبی انتہا پسند طبقے اپنی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح سے لبرل اور ترقی پسند حلقوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو مذہب کے خلاف جارحانہ انداز اختیار کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان دو اہم جماعتوں کے درمیان تصادم اور کشمکش کی صورتحال ہوگئی ہے اور جس کا آگے چل کر ہمیں کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم مغرب کے ماڈل کو اختیار کر لیں یا اپنے کلچر کو بنیاد بنا کر اُسے لبرل ازم اور ترقی پسندی کی طرف لے جائیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

میں یہاں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ لبرل اور ترقی پسندوں کو کسی کو مذہبی اشتعال دلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جب بھی مسائل پر بحث و مباحثہ کریں تو دلائل اور شائستگی کے ساتھ اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔ مشہور تاریخ دان ٹوائن بی (Toynbee) نے کہا ہے کہ ہر معاشرے کو چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب تک وہ ان کا جواب دیتا رہتا ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ لیکن جب اس کی توانائی ختم ہو جائے اور وہ موثر جواب نہ دے سکے تو ایسا معاشرہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے علماء اس قابل ہیں کہ موجودہ زمانے کے چیلنجوں کا جواب دیں سکیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر پسماندگی ہمارا مقسوم ہے۔

بلند اقبال

ہمارے ہاں سیکولرازم کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کو لادینیت کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہ کس حد تک درست ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سیکولرازم کو لادینیت کہہ کر مذہبی جماعتوں نے اس کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا ہے ورنہ اس کی آسان سی تعریف یہ ہے کہ ریاست کو مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہونا چاہیے جبکہ معاشرے میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی ہونی چاہیے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرے میں مذہب کا سیاسی استعمال نہ ہو۔ یہاں میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ ہندوستان میں جماعتِ اسلامی سیکولرازم کی حامی ہے۔ کیونکہ وہ اس نظام میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے جبکہ پاکستان میں یہی جماعت سیکولرازم کے خلاف ہے۔

بلند اقبال

ہمارا اسلامی معاشرہ جس کا مذہبی ذہن ہزاروں سال پرانا ہے اس کو تبدیل کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟

ڈاکٹر مبارک علی

یہ بتانا مشکل ہے کہ قوموں کے ذہن کتنی مدت میں تبدیل ہوتے ہیں۔لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ دنیا آج کل بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔

ٹیکنالوجی نے یہ کام اور تیز کر دیا ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک دوسرے سے جڑ گئی ہے۔ جمہوری روایات اور ادارے لوگوں کے سیاسی شعور کو بڑھا رہے ہیں۔ عالمی رابطے معلومات کو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں دنیا سے کٹ کر اپنی فرسودہ روایات میں پناہ لینا خودکشی کے برابر ہے۔ہمیں اپنی بقاء کے لئے ترقی کے عمل میں شامل ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ریاست کو مذہبی جھگڑوں سے دور ہو کر لوگوں کی فلاح کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ، آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی اصطلاح کے معنی ہمیشہ ایک نہیں رہتے ہیں۔ یہ برابر بدلتے رہتے ہیں، اس لئے سیکولرازم، کہ جس کے معنی لادینیت کے تھے اب بدل گئے ہیں۔ اور ہمیں اس کے نئے معنی یعنی مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کے مفہوم میں لکھنا چاہیے۔ اُمید ہے کہ آج کی یہ بحث ہمارے بہت سے الجھے ہوئے سوالات کا جواب دینے میں مدد دے گی۔

☆.....☆.....☆

11۔کیا ہندو، یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے دشمن ہیں؟

بلند اقبال

قوموں کی زبان میں الفاظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اگر الفاظ کو توڑ مڑوڑ کر اور پیچیدہ کر کے بیان کیا جائے یا لکھا جائے تو یہ مفہوم کو بدل دیتا ہے کچھ الفاظ مذہبی، سماجی اور سیاسی معنوں میں اس قدر مقبولیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کے تاریخی پس منظر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور الفاظ جو تعصّبات کو جنم دیتے ہیں یہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور معاشرہ ان کو حقیقت سمجھ کر قبول کرتا رہتا ہے۔ اس کی مثال ہمارے ہاں ہنود و یہود۔ نصاریٰ کی مسلم دشمنی سے دی جاسکتی ہے۔ یہ تاثر آخر مسلم معاشرے میں کیوں پیدا ہوا؟ اس کی تاریخی حقیقت کیا ہے؟ اور اس سے ہماری ذہنیت کس حد تک متاثر ہوئی؟ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے آج میرے ساتھ پروفیسر مبارک علی موجود ہیں۔ میں چاہوں گا کہ وہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس سوال کا جواب بھی میں چاہوں گا کہ آخر ان تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے متعلق مسلمانوں میں یہ تاثر کیوں آیا؟

ڈاکٹر مبارک علی

اس آخری سوال کا جواب میں آپ کو آخر میں ہی دوں گا۔مگر اس سے پہلے میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ قوموں میں آخر کیوں دوسروں کے بارے میں بدگمانیاں اور تعصّبات پیدا ہوتے ہیں۔اس کے پس منظر میں سازش کا تصور ہے۔مثلاً قوم کی اکثریت جو اپنے آپ کو متحد دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی اقلیتوں سے چاہے وہ مذہبی ہوں یا نسلی خوفزدہ رہتی ہے کہ وہ جھگڑے کر کے اس کو نقصان پہنچائیں گی۔اب چاہے یہ تضادات اس کے اپنے اندر ہی کیوں نہ ہوں اس کا الزام وہ اقلیتی جماعتوں کو دے گی۔

دوسرے اقوام یہ بھی سمجھتی ہیں کہ ان کے مخالف اقلیتی گروپوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اب میں آپ کو اس کی چند تاریخی مثالیں دینا چاہوں گا۔مثلاً رومیوں کے عہد میں جب کہ عیسائی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کم تھی۔ انہیں ہر خرابی، فساد، حادثے کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا مثلاً جب نیرو کے زمانے میں روم کے شہر میں آگ لگی تو اس کا الزام بھی عیسائیوں کو دیا گیا جس کے نتیجے میں مجمع نے ان کے گھروں کو لوٹا اور انہیں قتل کیا۔عہد وسطی میں جب یہودیوں کے معاشرے میں ان کی تعداد کم تھی تو انہیں ہر تباہی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں طاعون کی بیماری پھیلی تو اس کے ذمہ دار بھی یہودی ٹھہرے اور یہ افواہیں پھیلیں کہ انہوں نے کنوؤں کے پانی کو زہر آلود کر دیا ہے۔آگے چل کر یہودی اور بدنام ہوئے۔ 1650ء عیسوی میں پہلی مرتبہ ان کے بارے میں یہ مشہور ہوا کہ وہ عیسائی بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ان کے خون سے اپنی رسومات ادا کرتے ہیں۔ یہ روایت آگے چل کر دوسرے مذاہب میں بھی داخل ہوئی۔

اب میں آپ کے اس سوال کا جواب دینا چاہوں گا کہ مسلمانوں میں تینوں مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں تعصّبات کیوں آئے۔مثلاً اس کی بنیاد قوموں اور مذاہب کے ماننے والوں کے تعلق پر ہوتی ہے۔مسلمانوں کا پالا سب سے پہلے یہودیوں سے پڑا چونکہ تعلقات کشیدہ رہے۔اس لئے یہ سوچ پیدا ہوئی کہ یہودی منافقوں کی صورت میں مسلمانوں کی

تباہی کے درپے ہیں۔مسلمانوں کا دوسرا واسطہ عیسائیوں سے ہوا جب انہوں نے شام اور مصر کے ملکوں کو فتح کیا جہاں عیسائیوں کی حکومت تھی تو اس نے دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں دشمنی اور عداوت کو جنم دیا۔سب سے آخر میں مسلمانوں کا ٹاکرا ہندوؤں سے ہوا، سندھ اور شمالی ہندوستان کی فتح کے بعد جب مسلمان حکمران اقتدار میں آئے تو انہیں ہندو اکثریت سے بغاوتوں اور سازشوں کا خطرہ رہا۔ یہ وہ تاریخی پس منظر ہے جس نے مسلمانوں میں اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کی ذہنیت کو جنم دیا۔

سازش کی تھیوری کا فائدہ ہمیشہ حکمران طبقے اُٹھاتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے وہ اپنی کمزوری اور نااہلی کو چھپاتے ہیں اور سارا الزام دوسروں پر ڈال کر خود معصوم بن جاتے ہیں۔ اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اصل بہران کا تجزیہ نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی وجوہات کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ بلکہ رسمی طور پر اسے سازش قرار دے کر معاملے کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

بلند اقبال

سازشوں کے سلسلے میں آپ نے وضاحت تو کی مگر میں چاہوں گا کہ مسلم معاشرے میں یہودیوں کے کردار کے معاملے میں آپ سے معلومات حاصل کروں؟

ڈاکٹر مبارک علی

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اسلام کے ابتدائی ادوار میں مسلمان مؤرخ یہودی سازشوں کا ذکر کر رہے تھے۔مگر جب عباسی سلطنت مستحکم ہو جاتی ہے۔تو یہودی سازشوں کا ذکر بھی ختم ہو جاتا ہے۔عباسی دور میں بغداد میں یہودیوں کی آبادی تھی جہاں وہ امن اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ دارالحکومت میں بھی یہودی علماء موجود تھے اس لیے اس دور میں ہمیں اپنے خلاف کسی سازش کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ جب عربوں نے اسپین فتح کیا ہے تو ان کے ساتھ یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔جنہوں نے عربوں کے ساتھ مل کر اسپین پر حکومت کی۔ان کا سب سے بڑا فلسفی ابن مونا جسے موسیٰ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔اسپین ہی کا تھا۔وہاں سے یہ مصر

آیا اور سلطان صلاح الدین ایوبی کا طبیب خاص ہوا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں یہودی اور مسلمان دونوں پرامن طریقے سے رہ رہے تھے اور کوئی یہودی سازش ان کے درمیان نہ تھی۔ جب کہ عہد وسطی میں ان کے خلاف سخت مذہبی تعصّبات تھے۔ انہیں انگلستان، فرانس اور مشرقی یورپ کے کئی ملکوں سے نکالا گیا۔ جب 1492ء عیسوی میں اسپین میں عربوں کو شکست ہوئی تو ان کے ساتھ یہودیوں کو بھی وہاں سے نکالا گیا اور ان میں سے کچھ نے ترکی میں پناہ لی۔

یہودیوں کے خلاف سازش کی تھیوری میرے خیال میں موجودہ دور کی پیداوار ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسرائیل کا قیام عمل میں آیا اور اس کی حمایت امریکہ اور یورپ کے یہودیوں نے کی تو مسلمانوں میں یہودی سازش کا تصور مضبوط ہوگیا۔ کیونکہ اس وقت امریکہ اور یورپ میں یہودی تجارت، سیاست اور ذرائع ابلاغ پر قابض تھے، اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔

بلند اقبال

اب میں آپ سے ہندوؤں کے بارے میں سوال کرنا چاہوں گا؟

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخی طور پر اگر لفظ ہندو کو دیکھا جائے تو یہ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کی تاریخ کو ہم اس طرح سے دیکھتے ہیں کہ جب آریا ہندوستان میں آئے تو انہوں نے دریا کو سندھو کہا۔ ایرانیوں نے اس سندھ سے ہند کر دیا اور یونانیوں کے ہاں یہ اِنڈ یا انڈیکا ہوگیا۔ جب ترک ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے اسے ہندوستان بنا دیا، خود آریا اسے آریا ورت یا بھارت ورت کہتے تھے۔ لہٰذا ہندو یا ہندو مذہب کی اصطلاحات جدید دور کی ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ فرمایئے کہ ہندو مذہب اور ہندو کا اس سرزمین سے کیا تعلق ہے؟

قوموں کے ناموں کو اگر دیکھا جائے تو ان کا اپنی سرزمین سے تعلق ہوتا ہے جیسے جرمنی میں رہنے والے جرمن کہلاتے ہیں۔ فرانس کے رہنے والے فرانسیسی اور انگلستان میں رہنے والے انگریز کہلاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں رہنے والے تمام لوگوں کو ہندو کہنا چاہیے۔ چاہے ان کا مذہب کوئی بھی ہو جیسا کہ ایک مرتبہ سرسید احمد خان نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ چونکہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں اس لئے ہندو ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہندو کا تعلق سرزمین کے علاوہ مذہب سے بھی ہوگیا۔ اس لئے یہاں کے رہنے والوں میں مذہبی تفریق پیدا ہوگئی۔ اس تفریق کو خاص طور پر انگریزی دور میں ابھارا گیا اور مسلم کمیونٹی اور ہندو کمیونٹی کہہ کر دونوں کو جدا کر دیا۔ یہاں تک کے تاریخ کو بھی ہندو اور مسلمان بنا دیا۔

ہندو اور مسلمان اس ملک میں تقریباً ایک ہزار سال سے ساتھ رہ رہے ہیں اس ہم آہنگی نے ایک مشترک کلچر پیدا کیا ہے۔ ایک دوسرے کے رسم و رواج اور تہواروں کو سمجھا ہے۔ مثلاً اُردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے۔ لیکن یہ اشتراک اُس وقت ٹوٹا جب دونوں جانب سے سیاست دانوں نے اپنے مفادات کی خاطر ان میں تفریق کی۔ مثلاً ہندوؤں کے ایک رہنما ساورکر نے ہندوتوا کا نظریہ پیش کیا۔ جس کے تحت کہا گیا کہ جن مذاہب کے پیروکار ہندوستان میں پیدا ہوئے مگر ان کے مذہبی مقامات ہندوستان سے باہر ہیں تو اس صورت میں یہ ہندوستانی نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسلمان اور عیسائی دونوں کو ہندوستانی قوم سے خارج کر دیا گیا۔ دوسری جانب جب مسلمان رہنماؤں نے دوقومی نظریہ پیش کیا تو اس پر زور دیا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ ان کا کلچر، رسم و رواج، عادات، لباس، رہن سہن، سمجھ بوجھ، جدا جدا ہیں۔ یہ بڑی ستم ظریفی تھی کیونکہ خود ہندوؤں میں مختلف علاقوں کے لوگ ایک جیسے کلچر کے نہیں ہیں اور ان میں اختلافات ہیں، ہندو ذات پات کی وجہ سے ہر ذات دوسروں سے علیحدہ شناخت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ نہ یہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ یہی صورت مسلمانوں کی ہے کہ

بنگال، جنوبی ہندوستان، پنجاب اور سندھ کے مسلمان ثقافتی اور لسانی طور پر ایک نہیں ہیں اس لئے جب دوقومی نظریے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ یونٹ کے طور پر دیکھا گیا تو یہ سخت تاریخی غلطی تھی ۔لیکن ہندوتوا اور دوقومی نظریے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہزار برس کے اشتراک کو توڑ کر انہیں علیحدہ کر دیا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب میں آپ سے یہ سمجھنا چاہوں گا کہ ہم جب ہندوستان کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چاہے ہم ہندو ہوں، سکھ ہوں یا عیسائی ہوں اس سرزمین کے تعلق سے ان سب کو ہندو ہونا چاہیے۔لیکن ہندو کا لفظ ہندو مذہب سے متعلق ہو گیا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں جب ہم اسے بھارت کہتے ہیں تو یہ رہنے والوں کے درمیان مذہبی فرق کو مٹا دیتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کا یہ کہنا درست ہے کیونکہ آریا اس ملک کو آریاورت یا بھارت ودش کہتے تھے، ایران اور افغانستان سے آنے والوں نے اسے ہندوستان کہا اور یورپ کی اقوام نے یونانیوں سے لے کر اسے انڈیا کہا۔اب سرکاری طور پر اس کا نام بھارت ہے۔ جب کہ انڈیا کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔اس لحاظ سے اس کے تمام شہری یا تو بھارتی ہوئے یا انڈین۔

بلند اقبال

ہنود و یہود کے بعد اب ہم نصاریٰ کی جانب آتے ہیں۔ان سے نفرت کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات کی ابتداء میں ہندوستان سے کروں گا لیکن سب سے پہلے میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ عیسائی خود کو عیسائی کہلوانا پسند نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے لیے لفظ مسیحی کا استعمال کرتے ہیں۔ نصاریٰ کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی ولادت نصرت سے ہے جو کہ فلسطین میں ہے۔ عربی میں نصرت سے نصاریٰ بن گیا۔ جب انگریز اوّل اوّل ہندوستان میں آئے تو مسلمانوں نے ان سے سماجی تعلقات نہیں رکھے یہاں تک کہ اگر ان سے مصافحہ کر لیتے تھے تو گھر جا کر ہاتھ دھوتے تھے۔ ان جیسے بال رکھنا، لباس پہننا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب محسن الملک پہلی مرتبہ سرسید سے ملنے آئے اور انہیں ڈنر سوٹ میں کھانے کی میز پر چھری کانٹے سے کھاتے دیکھا تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ سرسید نے اپنی پوری زندگی میں اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں خوشگوار تعلقات ہوں۔ انہوں نے قرآن شریف اور بائبل کے ترجمے کر کے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دونوں مذاہب کے درمیان کوئی فرق نہیں اور دونوں ایک ہی پیغام دیتے ہیں۔

بلند اقبال

پروفیسر صاحب ذرا اس کی وضاحت کیجئے گا کہ عیسائیوں سے اختلاف کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمانوں اور عیسائیوں میں ابتدائی اختلافات کی بنیاد سیاسی تھی کیونکہ ان کی ابتدائی فتوحات کے نتیجے میں عیسائیوں کا اقتدار شام، عراق اور مصر سے ختم ہوا۔ اس کے بعد ان کی جنگیں بازنطینی سلطنت سے ہوتی رہیں۔

اس کے بعد گیارھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا اور اس کا خاتمہ اس

وقت ہوا جب صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے وہاں سے عیسائیوں کو نکالا لیکن صلیبی جنگوں کی یادیں، مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے ذہن میں باقی رہیں۔ مثلاً جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد انگریز مشرقِ وسطی میں آئے اور جنرل ایلن بی دمشق میں داخل ہوا۔ جہاں صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے تو اس نے زور سے یہ الفاظ کہے ''صلاح الدین ہم دوبارہ سے آ گئے ہیں'' اب بھی کروسیڈ کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو یہ تاریخ کی جنگوں کی یاد دلاتا ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں۔

بلند اقبال

یہ مفروضہ کہ ہنود و یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو تباہ کرنے کی سازش میں ملوث ہیں کیا یہ مسئلہ سیاسی سے زیادہ نفسیاتی تو نہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

اس کی تاریخی بنیادوں پر ہم بحث کر چکے ہیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ روسی انقلاب کے بعد مغربی طاقتوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے کمیونسٹ بھی ہنود و یہود و نصاریٰ کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن روس کے زوال کے بعد وہ اس فہرست سے خارج ہو گئے اس طرح سے پاکستان کے علاوہ دوسرے مسلمان ملکوں میں ہندو بھی سازش سے خارج ہیں۔ ان کے نزدیک یہود و نصاریٰ اس سازش میں شامل ہیں۔

آپ کا کہنا صحیح ہے کہ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے جب کوئی قوم پسماندہ ہوتی ہے۔ دوسری اقوام سے مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ تو اسے اپنی پسماندگی کی وجہ سازشوں میں نظر آتی ہے۔ کسی بھی قوم کے لیے اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کا اعتراف کرنا ہمت کی بات ہوتی ہے۔ کیونکہ پھر حکمران طبقوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عیاشیاں چھوڑ کر، بدعنوانیوں اور خرابیوں کو دُور کریں۔ لیکن یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ دوسرے پر سازش کا الزام لگا کر خود کو معصوم بنا لیا جائے۔ اور حالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہ لائی جائے۔ اس کی مثال بنگلہ دیش کی ہے۔ کیونکہ

ہم نے اسے سازش قرار دیا اور اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ اس لئے ہم بار بار سیاسی بحرانوں سے دو چار ہو رہے ہیں۔

بلند اقبال

کیا جب ہم ہنود و یہود و نصارا کو سازش قرار دیتے ہیں تو یہ فیصلہ بحیثیت مجموعی کر کے ان افراد اور جماعتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جو امن و اصلاح کے لئے کام کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی بات صحیح ہے کیونکہ کسی بھی قوم کے تمام افراد کی ذہنیت ایک جیسی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کسی بھی طرح پوری قوم کو سازشی کہنا غلط ہوتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے گا کہ جب کسی قوم کی نفسیات میں اس قسم کے مفروضے جڑ پکڑ لیں تو کیا یہ نہیں ہوتا کہ ایک نسل کا جھوٹ دوسری نسل میں جا کر سچ ہو جاتا ہے؟ آج کل کے اس گلوبل زمانے میں ہم اس صورتحال سے کیسے نبٹیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

آپ نے یہ بات جو کہی کہ ایک نسل کا جھوٹ دوسری نسل میں جا کر سچ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تاریخ نہیں پڑھتے ہیں کہ خیالات اور نظریات کی بنیاد کہاں ہے ان کی جڑیں کہاں ہیں، اگر ان سے واقف ہو جائیں اور یہ کام تاریخ کا ہے کہ وہ تبدیلی کے مراحل کو قلم بند کرتی ہے تو اس صورت میں جھوٹ جھوٹ ہی رہے گا۔ آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ ہم ایک گلوبل ورلڈ میں ہیں اور ذرائع ابلاغ ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ علم اور معلومات کا پھیلاؤ ہے ان حالات میں وہی قومیں ترقی کر سکتی ہیں جن کے پاس علم ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی

بتاتی ہے کہ نفرت کی بنیاد پر کوئی قوم نہ تو باشعور ہوسکتی ہے اور نہ ترقی کرسکتی ہے۔ پھر دوسروں سے نفرت وہیں تک نہیں رہتی ہے بلکہ یہ قوموں کے اندرونی معاملات میں بھی آ جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں مذہبی فرقوں، سیاسی جماعتوں اور علاقائی لوگوں کے درمیان نفرتوں کی دیواریں ہیں۔ جس کا نتیجہ آئے دن کے فسادات اور قتل و غارت گری ہے۔ لیکن اس تمام تباہی کے باوجود نفرت کے ذریعے مسائل حل نہیں ہوسکے۔

بلند اقبال

ہم دیکھتے ہیں کہ کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں جو مسلمان آباد ہیں۔ یہاں بھی وہ دوسروں سے علیحدہ رہ کر خود کو سازشوں سے محفوظ سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

آپ کی یہ بات درست ہے، یہ ان مسلمانوں کے لئے جو یہاں آباد ہیں ضروری ہے کہ مغرب کے کلچر کو سمجھیں اور یہاں جو سماجی علوم اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی ہو رہی ہے اس کا حصہ بنیں۔ اگر وہ سازش اور نفرت کے زیر اثر رہے تو ان میں دوسروں سے سیکھنے کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔

پاکستان کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہندوستان سے ہماری نفرت ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر ہمارے اچھے تعلقات ہوں گے تو ہم ہندوستان سے بہت کچھ سیکھ سکیں گے۔ خاص طور سے تعلیم کے میدان میں، لیکن اگر ہم لوگوں کو مشتعل کرتے رہے لوگوں کو بھڑکاتے رہے تو اس کا نقصان ہم اٹھائیں گے۔ اس لئے نفرت و سازشی ذہن کو ختم کرنا ترقی کی علامت ہوتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ذرا اس کی وضاحت کریں کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم رواداری

کی بجائے تنگ نظری کا باعث کیوں بن رہی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

اس کی وجہ ہمارا تعلیمی نظام اور ہماری نصابی کتابیں ہیں۔ خاص طور سے اسکول کی نصابی کتابوں میں جو مواد دے گیا ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ طالبعلم کو مخصوص معلومات فراہم کی جائیں، ان میں ہندوستان سے نفرت، مذہبی اقلیتوں کے بارے میں غلط معلومات اور عورتوں کے حقوق سے انحراف شامل ہیں۔ جس کی وجہ سے نوجوانوں کا ذہن ان معلومات کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔ اور وہ زندگی بھر ان ہی مفروضوں کو سچ سمجھ کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ تعلیم اس وقت ان نفرت کی زنجیروں سے آزاد ہوسکتی ہے جب ریاست اور قانون مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہوں اور ہر فرد کو چاہے اس کا مذہب کوئی بھی ہو، اس کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ اور دانشوروں کو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ معاشرے میں امن وصلح کے جذبات پیدا کریں۔ نفرتوں سے لوگ بہت جلد مقبولیت تو حاصل کر لیتے ہیں جیسا کہ ہم اخبارات اور ٹی وی چینلز کے کالم نگاروں اور لائیو پروگرام پیش کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر قوم پر بحیثیتِ مجموعی تباہ کُن اثرات ہو رہے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی خوبصورتی اور وضاحت سے ہمیں بتایا کہ مسلمان معاشرے میں جو یہ خیال چھایا ہوا ہے کہ ہنود و یہود و نصاریٰ ان کے دشمن ہیں درحقیقت ایسا نہیں ہے، بلکہ دیکھا جائے تو ہم خود اپنے دشمن ہیں۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم سر کاٹ کر، خون بہا کر اور نفرتوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں یا امن، صلح اور بھائی چارے کے ساتھ، محبت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔

☆.....☆.....☆